صداقتیں



الطاف حسن قریشی

ملاقاتیں

ملک کی عظیم سولہ شخصیتوں سے ملاقاتوں کی رُوداد، جس میں زندگی کے نشیب و فراز بھی ہیں اور مسائل کے پیچ و خم بھی اور جسے پڑھ کر فکر اور خیال میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔

الطاف حسن قریشی

تعداد	پانچ ہزار
اشاعت اول	اکتوبر ۱۹۶۳ء
ناشر	اردو ڈائجسٹ پبلی کیشنز ۔ لاھور
مطبع	نوائے وقت پرنٹرز لاھور
قیمت	پانچ روپے

انتساب

اُن کے نام جو اپنے مسائل کے بارے میں بہت کم سوچتے ہیں اور جب سوچتے ہیں تو دوسروں کے دماغ سے ....

اِن سے ملیے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۱۷
مسٹر اے۔ کے۔ بروہی ۴۳
میاں بشیر احمدؒ ۶۳
مولوی تمیز الدین خاں ۸۱
پروفیسر حمید احمد خاں ۹۵
ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین ۱۱۱
جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن ۱۲۳
مولانا صلاح الدین احمدؒ ۱۳۵
ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۴۹
ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر ۱۶۵

مولانا غلام رسول مہر	۱۷۵
جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی	۱۹۱
جسٹس محمد شریف	۲۰۵
چودھری محمد علی	۲۲۳
چودھری نذیر احمد خاں	۲۴۱
حکیم نیتر واسطی	۲۵۷

پہلی کرن

چھوٹے آدمیوں کو بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کی اکثر آرزو رہتی ہے، شاید اس لیے کہ اس طرح "چھوٹے پن" پر "بڑے پن" کا سایہ پڑ جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو آجکل اصل قدر و قیمت "سائے" کی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا جو سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے ہیں، وہ بالآخر ایک روز ظلِ سبحانی بن جاتے ہیں۔

چھوٹا آدمی ہوتے ہوئے بھی میری نفسیات اس گروہ کی نفسیات سے کلیتہً مختلف ہے۔ مجھے بڑے آدمیوں سے ڈر سا لگتا ہے، میں جب انہیں دور سے آتا دیکھتا ہوں، تو ایک کونے میں دبک جاتا ہوں۔ میں خود ہی ان کے راستے سے ہٹ جاتا ہوں، یہ سوچ کر کہ اگر خود نہ ہٹا تو ہٹا دیا جاؤں گا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے۔

"بڑے آدمیوں" سے دور رہنے کی خواہش شاید مجھ میں اس لیے شدت اختیار کر گئی ہے کہ میں خود "بڑا آدمی" نہ بن سکا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم ایک چیز کو حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ میں پاکستان کا وزیرِ اعظم بن گیا ہوں۔ عہدہ سنبھالتے ہی

مجھ میں عجیب نوع کا تغیر رونما ہوا۔ ہم نے سب سے پہلے اپنے خادم کو خوب گالیاں دیں اور پھر اُسے خوب پیٹا۔ طلباء کا ایک وفد ہم سے ملنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ پہلے تو ہم نے وفد کے ساتھ ملنے سے انکار کر دیا، لیکن جب ہمارے سکرٹری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ اس طرح معاملہ بگڑ جائے گا، تو ہم نے وفد کو شرفِ باریابی بخشا۔ دو منٹ کی گفتگو کے بعد ہم نے وفد کے قائد کو دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنی تخریبی سرگرمیوں کو ختم نہیں کیا تو تمہیں مزہ چکھا دیا جائے گا۔ اس پر ایک طالب علم نے کچھ کہنے کی گستاخی کرنا چاہی، تو ہم نے اپنے "سائے" کی طرف اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے طلباء آہنی زنجیروں میں جکڑ لیے گئے اور مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

یہ خواب اس وقت کا ہے جب مَیں ابھی خود طالب علم تھا۔

مَیں بعد میں کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ جب مَیں خواب کے عالم میں یہ کچھ کر سکتا ہوں، تو اگر خدانخواستہ میرے ہاتھ میں اختیارات آ گئے یعنی مَیں بڑا آدمی بن گیا، تو کیا نہ کر گزروں گا۔ پہلے تو مجھے اطمینان تھا کہ مجھے اختیارات مل ہی نہیں سکتے، کیونکہ بچپن سے سنتے آئے تھے کہ خدا گنجوں کو ناخن نہیں دیتا، لیکن آجکل دیکھنے میں آیا ہے کہ گنجوں کے بھی ناخن ہوتے ہیں اور وہ اپنا سر نوچنے کی بجائے دوسروں کا سر نوچتے ہیں۔

ایک روز میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ تم میں "بڑے آدمی" بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ سنتے ہی میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ مجھے اپنے متعلق تشویش لاحق ہوئی کہ یہ جراثیم میرے اندر کیسے گھس آئے۔ کچھ دیر سوچ کر مَیں نے اپنے آپ سے سوال کیا:

"کیا اپنا کوئی رشتہ دار یا دوست درآمد و برآمد کے محکمے میں کسی اونچے عہدے پر لگا ہوا ہے؟"

حافظے نے نفی میں جواب دیا اور میری جان میں جان آئی کیونکہ اونچے حلقوں سے سنا ہوا ہے کہ ہمارے ملک میں "بڑے آدمی" درآمد ہوتے ہیں اور کبھی کبھی برآمد ہو بھی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مَیں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں یورپ کے عظیم آدمیوں کا ذکر تھا۔ اس کتاب نے مجھے کچھ سوچنے

پر مجبور کر دیا۔ مَیں سوچنے لگا آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہماری قوم میں صرف "بڑے آدمی" پائے جاتے ہیں اور اس میں "عظیم آدمیوں" کا فقدان ہے۔

اس احساس کے تحت مَیں نے فیصلہ کیا کہ اگرچہ ماحول خاصا تاریک ہے، تاہم مَیں قوم کے عظیم آدمیوں کو تلاش کروں گا، اُن سے ملوں گا، مختلف مسائل پر اُن سے باتیں کروں گا اور ان کے افکار ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا دوں گا، شاید ان افکار کی حرارت سے قوم کے "تنِ مردہ" میں کچھ جنبش پیدا ہو جائے۔

مَیں نے اس فیصلے کے کچھ دنوں کے بعد یہ محسوس کیا کہ مجھ میں قوم کی عظمت کا جو درد اٹھا تھا، وہ آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ دُکھ سا ہُوا اور یہ دُکھ اس وقت اور زیادہ تکلیف دہ ہو گیا جب میری ملاقات ایک لیڈر خاتون سے ہوئی۔ اُسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، ان کا جسم فرانسیسی ساڑھی میں لپٹا ہُوا تھا۔

"یہ ــــ تم؟" میری زبان گھبراہٹ میں جملہ مکمل نہ کر سکی۔

"ہاں، ہاں، یہ مَیں ہوں۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم میری طرف پھٹی پھٹی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"محترمہ، تمہیں وہ دن یاد ہے جب تم نے بھری محفل میں قسمیں کھا کھا کر یہ کہا تھا کہ اس دن کے بعد سے مَیں پاکستانی کپڑے کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں پہنوں گی ــــ اور آج ــــ"

"الطاف، تم بہت ہی سیدھے ہو۔ یہ سب باتیں صرف وقت کی پیداوار ہوتی ہیں، وقت گزر گیا اور عہد و پیمان بھی ختم ہو گئے ــــ اور تم جانتے ہو کہ ہمارا جوش وقتی ہُوا کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے ــــ"

اتنا کہہ کر وہ رک گئیں، پھر آہستہ سے کہا:

"ہمارے عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے، کسے یاد رہتا ہے، کس نے کس وقت کیا عہد کیا تھا۔"

وہ محترمہ تو چلی گئیں، لیکن میرے ذہن میں ارتعاش پیدا کر گئیں۔ میں سوچتا رہا:

"کیا میرے عہد کا بھی یہی انجام ہو گا؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" اندر سے ایک آواز ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں نے اپنے شوق کو سرد پڑنے نہیں دیا۔ میں ملک کے عظیم لوگوں سے ملا۔ اُن کے اندر جھانکا، ان سے روشنی جذب کی اور اس روشنی کو دوسروں تک پہنچایا۔ یہ "ملاقاتیں" اسی روشنی کا انعکاس ہیں۔

میں محترمہ کا شکرگزار ہوں جن کی باتوں نے، اگرچہ اب وہ اپنی یہ باتیں بھول گئی ہوں گی، مجھے وقت کی گردش میں گم ہونے سے بچا لیا اور میں "ان عظیم شخصیتوں" کا ممنونِ احسان ہوں جنھوں نے "مصلحتوں" اور "اندیشوں" سے بے نیاز ہو کر "اعلانِ حق" کا فریضہ ادا کیا۔

آپ کے ذہن میں یہ الجھن ضرور پیدا ہوتی ہو گی کہ "بڑے آدمی" اور "عظیم آدمی" میں کیا فرق ہے۔ شاید لغت اس فرق کو واضح نہ کر سکے۔ آپ "ملاقاتیں" غور سے پڑھیے، یہ فرق آپ پر از خود واضح ہو جائے گا۔ میں اس لیے نہیں بتاتا کہ مجھے بڑے آدمیوں سے خوف آتا ہے اور عظیم شخصیتوں کے احترام میں میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

۵۔ شاہراہ سمن آباد، لاہور

۲۶ جون ۶۳ء

الطاف حسن قریشی

ملاقاتی خاکے

کائنات جن بے شمار اور گوناگوں مظاہر کا مجموعہ ہے ان میں انسان اور اس کی شخصیت سے زیادہ پیچیدہ شاید کوئی چیز نہیں۔ انسان جس لمحے عالمِ وجود میں قدم رکھتا ہے، اسی لمحے سے اس کا ماحول اس پر اپنا عکس ڈالنا اور رنگ چڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ آگے آنے والا ہر لمحہ اس عکس میں گہرائی اور اس رنگ میں پختگی پیدا کرتا ہے اور انسان کی بے نقش اور بے رنگ فطرت آہستہ آہستہ عکس اور رنگ کے اِن پردوں کے اندر چھپتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اِن پردوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ اِن پردوں میں سے صرف چند دکھائی دیتے ہیں، باقی وقت اور زمانے کے ڈالے ہوئے چند در چند پردوں میں چھپ کر رہ جاتے ہیں اور ان سب پردوں کی آڑ میں وہ چیز ہوتی ہے جسے ہم انسان کی شخصیت کہتے ہیں اور یوں انسان کی شخصیت کی تشکیل، تعمیر اور تکمیل کا عمل گویا تہ در تہ حجابات میں چھپنے کا عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر انسان ایک معمّہ بن گیا ہے کہ دنیا برابر اسے حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور یہ معمّہ حل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ آدمی تنہا اپنی ذات کا معمّہ حل کرنے، اپنا سراغ لگانے اور اپنے آپ کو جاننے، پہچاننے اور

پا جانے کی کوشش میں بھی ناکام رہتا ہے۔ اور اپنی ذات کے معمّے کو حل کرنے کی دشواری ہی نے اُسے عقدہ کشائی کے بہت سے گُر سکھائے ہیں۔

ہم انسانوں کو ان کی رفتار و گفتار سے پہچانتے ہیں اور ان کے ظاہری عمل اور ردِّ عمل کو دیکھ کر اُن کے باطن کی کیفیتوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ انسان شاعر اور ادیب بن کر اپنے اشعار اور ادبی تخلیقات کے ذریعے اپنے اندر کو باہر لاتا ہے۔ مصوّر کی تصویروں کے رنگ اس کے چھپے ہوئے رازوں کی غمّازی کرتے ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے بے لوث اور بے تکلّف خط اور اس کے تسبوں کی خاموشی میں لکھے ہوئے روزنامے اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے علاوہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ زندگی اس کی نظر میں کیا ہے اور مختلف وقتوں میں وہ اس کے دل پر کیا کیا نقش بٹھاتی اور جماتی رہی ہے۔

انسان کی شخصیّت اس کے عمل کے ان مختلف مظاہر سے جس طرح اُبھرتی اور دوسروں کے سامنے آتی ہے اس میں خود عمل کرنے والے کے ارادے کو کم دخل ہوتا ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار یا خط اور روزنامچہ لکھنے والا جو کچھ لکھتا ہے اس لیے ہرگز نہیں لکھتا کہ اس طرح وہ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے لانا چاہتا ہے لیکن اس کی یہ تخلیقات چونکہ اضطراری طور پر اس کے باطن سے نکل کر ظاہر میں آتی ہیں، اِس لیے اُس کی اصلیّت کو اپنے ساتھ لاتی اور اس کی شخصیت کے اظہار کا سبب بنتی ہیں۔ شخصیّت کے اظہار اور اس کے اپنی اصلی روپ میں سامنے آنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آدمی کبھی کبھی اپنے آپ سے سوال کرتا رہے۔ اسی کا نام محاسبہ ہے کہ اس کی روشنی میں انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے، زندگی میں اپنا مقام متعیّن کرنے اور اس بات کا فیصلہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ کن چیزوں کو ترک اور کنہیں اختیار کرے۔ اس کا یہ فیصلہ چونکہ سچے محاسبے پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کی مدد سے دوسروں کو بھی زندگی کے نشیب و فراز کے سمجھنے اور اس کے مفہوم سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔

نئے زمانے نے محاسبۂ نفس کے اس طریقے کو ترک کر کے شخصیتوں کے نمایاں کرنے اور ان کے

تجربات، مشاہدات اور افکار سے فائدہ اٹھانے کے ایک نیا طریقہ اختیار کیا، جس سے سقراط کے طریقے کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ یہ نیا طریقہ صحافت اور اس کے فن کی روز افزوں ترقی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ہم بعض ایسے لوگوں سے جن کی بات معاشرے میں وزن رکھتی ہے کچھ سوال کرتے ہیں اور ان سوالوں کے جو جواب ملتے ہیں ان سے سیاست اور اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی معاشرتی گتھیوں کو سلجھانے کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ زمانہ چونکہ تخصص کا ہے اس لیے انسان ان مسائل کے متعلّق زیادہ سوچتا ہے جو اس کے پیشے یا معاشرتی منصب سے تعلّق رکھتے ہیں اور اسی لیے سوال کرنے والے سوال کرنے سے پہلے یہ سوچ لیتے ہیں کہ کس سے کس طرح کے سوال کرنے چاہئیں۔ پھر ان سوالوں کی نوعیت بھی موقع محل کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ سوال اگر اخباروں کے نمائندے کریں تو ظاہر ہے کہ سوال صرف ہنگامی موضوعات کے متعلّق ہوں گے، لیکن یہی سوال اگر رسالوں کے لیے کئے جائیں تو ان میں کسی نہ کسی طرح کا نظم بھی ہوگا اور ایک واضح مقصد بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں سوالات اسی دوسری قسم سے تعلّق رکھتے ہیں۔ لیکن بعض دوسرے رسالوں کے طریق سے بچ کر اردو ڈائجسٹ کے مُستفسِر یا سوال کرنے والے نے ملاقاتوں کے ذریعے سوال جواب کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ کئی حیثیتوں سے پسندیدہ اور مفید ہے۔

سب سے پہلی بات تو ناموں کی اس فہرست کو دیکھ کر ظاہر ہوتی ہے جنھیں ملاقات کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ وہ سولہ خاکے جو اس مجموعے میں شامل ہیں ایسے افراد اور اشخاص کے ہیں جو معاشرتی زندگی کے مختلف اہم شعبوں سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اس فہرست میں صحافی، ادیب، شاعر، فلسفی، معلّم، حکیم، وکیل، عالمِ دین، سیاست داں، قانون ساز، ماہرینِ اقتصادیات، عدلیہ و انتظامیہ کے اعلیٰ ارکان اور سفیر شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدانِ عمل اور شعبۂ زندگی میں وہ مقام اور مرتبہ حاصل کیا ہے کہ جو کچھ وہ کہیں اُسے اِس خاص موضوع اور اس موضوع سے تعلّق رکھنے والے مسائل پر حرفِ آخر سمجھنا چاہیئے۔ ان تمام شخصیتوں نے اپنے اپنے پیشے اور مسلکِ حیات سے طویل تعلّق کی بناء پر

جو کچھ دیکھا ہے وہ ان کے سوا کسی اور کی نظر میں نہیں۔ پھر یہ کہ ان کے عملی تجربے پر فکر و فہم کی جو آنچ لگی ہے، اس نے ان تجربات کو پختگی بھی بخشی ہے اور ایسی گہرائی اور گیرائی بھی کہ ہر زمانے کا انسان ان سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

ان خاکوں کا جو طویل ملاقاتوں کے بعد مرتّب کئے گئے ہیں ایک پہلو تو ان کا یہ تنوّع اور ہمہ گیری ہے جس کی طرف مَیں نے ابھی اشارہ کیا، لیکن اس سے بھی زیادہ میرے نزدیک ایک بات اور ہے۔ اس طرح کے ملاقاتی خاکوں میں سب سے زیادہ اہم چیز وہ سوالات ہیں جو اس شخصیّت سے کئے جاتے ہیں جس کے خیالات معلوم کرنے مقصود ہیں۔ سوال اگر واضح ہونے کے بجائے مُبہم اور پیچیدہ ہے تو امکان، اندیشہ بلکہ یقین ہے کہ جواب بھی مبہم، غیر واضح اور پیچیدہ ہوگا اور کسی واضح نتیجے تک پہنچنے میں مدد نہیں دے گا۔ اب اگر سب سوالوں کی نوعیت ایسی ہی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اہم باتوں کے بجائے غیر اہم باتیں سامنے آئیں گی اور جس شخص سے گفتگو کی جا رہی ہے کہ اس کی شخصیت یا تو پوری طرح اُبھر کر سامنے نہیں آسکے گی یا اُس کے ایسے رخ سامنے آئیں گے جن کی انفرادی حیثیّت نسبتاً کم ہے۔ اس اعتبار سے اس طرح کے ملاقاتی خاکوں میں سوال کرنے والے کی ذمّہ داری بہت بڑی ہے اور یہ ذمّہ داری اس سے کئی باتوں کی طالب اور متقاضی ہوتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ملاقات کرنے سے پہلے وہ اپنی منتخب کی ہوئی شخصیت کے متعلّق زیادہ سے زیادہ معلومات مہیّا کرے، یہاں تک کہ وہ اس شخص کی حد تک "گھر کا بھیدی" بن جائے کہ جب "لنکا ڈھانے" کا وقت آئے تو اس کا کوئی وار اوچھا نہ پڑے۔

شخصیّت کے متعلّق پوری معلومات فراہم کرنے کے بعد دوسری منزل ان معلومات پر سوچ بچار کرنے اور اہم اور غیر اہم میں امتیاز کرنے کی ہے کہ اس امتیاز کے بغیر صحیح اور نتیجہ خیز سوالات کا مرتّب کرنا ممکن نہیں۔ صحیح اور نتیجہ خیز سوالات میرے نزدیک وہ ہیں جو پوری طرح واضح ہوں، جواب دینے والے کے تصوّرات و تخیّلات کو پوری طرح بیدار کر سکیں، اسے سوچنے پر مجبور کریں، اس کے مزاج میں کبیدگی نہ

پیدا ہونے دیں اس لیے کہ شگفتگی اور انبساط ہی فکر و خیال کو بیدار کرنے، انہیں ابھارنے اور مہمیز لگانے کا وسیلہ بنتے ہیں اور اس طرح دل کی بات کھُل کر سامنے آتی ہے۔ ملاقاتوں میں جب تک بے تکلّفی کی فضا نہ پیدا ہو اور جب تک سوال کرنے اور جواب دینے والے فکری اور جذباتی اعتبار سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہوں، سوال اور جواب دونوں کھوکھلے رہتے ہیں، ان میں گہرائی اور معنویت نہیں پیدا ہوتی۔ اس لحاظ سے سوال کرنے والے کا کام اور بھی دشوار بن جاتا ہے اس لیے کہ اسے ہر نئی شخصیت سے ملاقات کرتے وقت اپنے آپ کو اس کے مزاج کے سانچے میں ڈھالنا اور اس کی شخصیت کے رنگ میں رنگنا پڑتا ہے۔

ہمارے رسالوں میں شخصیتوں کے جو ملاقاتی خاکے عام طور سے شائع ہوتے رہتے ہیں اُن میں عموماً ان سب باتوں کی کمی نظر آتی ہے جن کی طرف مَیں نے اشارہ کیا اور اس کا اثر عموماً یہ ہوتا ہے کہ ان لکھی ہوئی باتوں کو پڑھنے والا پڑھتا ہے تو اسے بہت کم موقعوں پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعارف ایک عظیم شخصیت سے ہوُا ہے اور اس تعارف کے بعد اس نے اپنے آپ کو سوچنے پر مائل پایا ہے، اپنے آپ میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے اور اس کے دل میں کچھ چیزوں کو ترک اور کچھ کو اختیار کرنے کی لگن پیدا ہوئی ہے۔

اردو ڈائجسٹ کے یہ ملاقاتی خاکے اس لحاظ سے فکر انگیز اور نتیجہ خیز ہیں کہ ان کے مرتّب کرنے میں ان تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو اس طرح کے خاکوں کی ترتیب و تدوین میں فنّی لوازم کی حیثیّت رکھتی ہیں۔ ان سولہ خاکوں میں سے نہ کوئی خاکہ ایسا ہے کہ اسے رسمی کہا جا سکے اور نہ ایسا کہ اُسے پڑھتے وقت دلچسپی اور شوق میں برابر اضافہ نہ ہوتا رہے۔ پڑھنے والا پڑھنا شروع کرتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس فضا کا ایک حصّہ بن گیا ہے جو خاکہ مرتّب کرنے والے نے بنائی ہے اور پھر اس بے تکلّفی اور یگانگت کی زندگی نت روپ لے کر سامنے آتی ہے۔ اس کے رخ سے پردے اٹھتے جاتے ہیں اور ہر آن ایک ایسا جلوہ سامنے آتا ہے جس سے نظر اس سے پہلے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ بے تکلّفی اور یگانگت کی اس فضا

میں جذبہ، خیال اور فکر سب برابر اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور جب ملاقات کی روداد ختم ہو چکتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ہم سے قریب تر آ گئی ہے اور ہم اس کے بعض ایسے رازوں سے آشنا ہوئے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اب تک ہماری نظر سے پوشیدہ تھے۔

اِن خاکوں کی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ یہ ہمیں اپنے دَور کی بہت سی نمایاں شخصیتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر زندگی کے بعض پیچیدہ اور اہم مسائل کے متعلّق ان کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس نقطۂ نظر کی روشنی میں زندگی کی بہت سی گتھیاں خود بخود سُلجھ جاتی ہیں ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھے گا ان کی اہمیّت میں اضافہ ہوگا کہ یہ سب خاکے ایسی شخصیتوں کے تجربات، احساسات کا مجموعہ ہیں جو صاحبِ نظر بھی ہیں اور صاحبِ بصیرت بھی اور انہوں نے ماضی اور حال کی شمعوں کی روشنی میں مستقبل کی وہ تصویر دیکھی ہے جو ہر آنکھ کو نظر نہیں آتی۔

لاہور، ۳۱ر جنوری ۱۹۶۳ء

دتا ر مسلم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

آج سے تقریباً سترہ سال پہلے کی بات ہے کہ میری عمر صرف بارہ تیرہ سال کی تھی اور مَیں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سال کے وسط میں ہماری جماعت کے لیے ریاضی کے نئے اُستاد آئے۔ ان کا نام چودھری نظام الدین تھا۔ ان کی شخصیت نہایت سادہ لیکن بے حد جاذب تھی۔ مَیں ان کی طرف کھنچتا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مَیں اکثر ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔

چودھری صاحب کو اردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا اور مجھے بھی بچپن ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ ہم اکثر ادبی، علمی اور دینی مسائل پر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے۔ یہ گفتگوئیں مجھے اچھی اور معلوماتی کتابوں کے مطالعے پر ابھارتی رہتی تھیں۔

اکتوبر کی ایک صبح کو مَیں نماز پڑھتے ہی چودھری صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہ چولھے پر چائے تیار کر رہے تھے جب چائے تیار ہوگئی تو انھوں نے مجھے بھی چائے کی پیالی دی اور خود بھی پینے لگے۔ چائے تو پی ہی اس لیے جاتی ہے کہ آپس میں باتیں کی جاسکیں۔ چودھری صاحب کی باتوں کی حلاوت نے چائے کی مٹھاس میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

دورانِ گفتگو میں مَیں پوچھ بیٹھا :-

"آپ کے نزدیک آج کل اُردو کا سب سے اچھا نثر نگار کون ہے ؟"

"سیّد ابوالاعلیٰ مودودی" چودھری صاحب نے بے ساختہ جواب دیا۔

پھر انہوں نے ہاتھوں کو خاص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا :-

"وہ اس انداز سے لکھتا ہے کہ آگ لگاتا چلا جاتا ہے"

نظام الدین صاحب کے یہ فقرے غیر شعوری طور پر میری کتابِ ذہن پر منقّش ہو گئے۔

مَیں سکول کے کام سے فارغ ہو کر مودودی صاحب کی کتابیں پڑھتا اور چودھری صاحب ان کتابوں کے متعلّق گفتگو کرتے رہتے۔ اسی طرح دو تین سال بیت گئے۔ پاکستان بنا اور ہم وقتی طور پر نواں کوٹ لاہور کے گرد و نواح میں آکر ٹھہرے۔ غالباً یہ ۱۹۴۸ء کا آغاز تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور مجھے معلوم ہوا کہ مودودی صاحب سردار پورہ اچھرہ کی مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ان دنوں میرے پاس سائیکل بھی نہ تھی۔ مَیں پیدل نواں کوٹ سے سردار پورہ پہنچا۔ مودودی صاحب کو دیکھنے کے لیے میری نگاہیں تمام نمازیوں کا طواف کر رہی تھیں۔ نماز کے بعد مولانا نے درس کا آغاز سورہ بقرہ سے کیا۔ مولانا میرے اس تصوّر کے قریب قریب نکلے جو مَیں نے ان کے بارے میں برسوں سے قائم کیا ہوا تھا۔ مودودی صاحب سے پہلی بار تفسیرِ قرآن سُن کر مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ نہ زورِ خطابت، نہ فلسفہ و حکمت کی باتیں، نہ عربی کی لمبی لمبی اور طویل عبارتوں کے حوالے۔ بس قرآن کے مفاہیم کا سیدھا سادہ اور مختصر بیان۔ تاہم مَیں مسلسل درس میں شریک ہوتا رہا اور میرے ذہن کے سانچے ٹوٹتے، پگھلتے اور نئے انداز میں ڈھلتے رہے۔

مجھے تلاشِ معاش میں لاہور سے باہر جانا پڑا اور زندگی کے جھمیلوں میں اتنا گھر گیا کہ کچھ یاد نہ رہا۔ چار پانچ سال یہی کیفیت رہی۔ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں قدرت مجھے پھر لاہور لے آئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب لاہور، مارشل لاء کی آہنی گرفت میں تھا اور ملک کی سیاسی فضا میں اضطراب اور بے چینی کے بادل

تیر رہے تھے۔ ۱۲ مئی ۱۹۵۳ء کی صبح کو اخبار آیا تو میری نگاہ اس سرخی پر پڑی:۔

"ابوالاعلیٰ مودودی کو فوجی عدالت نے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا"

مجھے دفعتاً ماضی کے تمام واقعات یاد آگئے۔ مودودی صاحب کا باوقار، شگفتہ اور سرخ وسفید چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ نجانے میرا اضطراب ہر لحظہ کیوں بڑھ رہا تھا۔ میں اسی عالم میں سیر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مسلم ٹاؤن کے قریب سے جو نہر گزرتی ہے، اس کے کنارے ٹہلتا رہا۔ میرا ہر قدم بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے مودودی صاحب سے کچھ زیادہ عقیدت بھی نہیں تھی، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ ایسے بلند پایہ نثر نگار اور جید عالم کو اس انداز سے سزائے موت دینا صریحاً زیادتی ہے۔ دل کی یہی آواز شعروں میں ڈھلنے لگی اور وہیں پندرہ بیس منٹ میں ایک غزل موزوں ہو گئی:۔

وہ اور ہی ہوں گے کم ہمت آلام ومصائب سہہ نہ سکے
شمشیر وسناں کی دھاروں پر جو حق وصداقت کہہ نہ سکے

اک جذبِ حصولِ مقصد نے یوں حرص وہوا سے پاک کیا
ہم کفر کے ہاتھوں بک نہ سکے، ہم وقت کی رَو میں بہہ نہ سکے

تم دار ورسن کی منزل کو اربابِ تعیش کیا جانو
ہم جامِ شہادت پی پی کر وہ کہہ گئے، جو کچھ کہہ نہ سکے

تھے تم سے زیادہ طاقتور، پر چشمِ فلک نے دیکھا ہے
توحید کا طوفاں جب اٹھا، وہ مدِ مقابل رہ نہ سکے

الطافِ محبت اور ہے کیا جز سوزِ دروں، جز دردِ نہاں
وہ چھلکے بھر کے نالے بنے، جو آنکھ سے آنسو بہہ نہ سکے

میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اشکوں کا یہ سیلاب کسی طرح رکتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نہر کے پل پر

بیٹھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، حالانکہ میں زندگی میں اس سے پہلے اپنی عزیز بہنوں کی موت پر بھی نہیں رویا تھا۔

اسی ذہنی کرب و اذیت میں پانچ چھ روز گزر گئے۔ اب صرف ایک ہی خواہش دل و دماغ میں جاگزین تھی کہ مودودی صاحب کو ایک نظر دیکھا جائے۔ میں نے جیل میں ان سے ملاقات کرنے کا انتظام کر لیا۔ ہم چار پانچ ساتھی مودودی صاحب کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے وہ خاص لباس زیب تن کیا ہوا تھا جو موت کی سزا پانے والے قیدیوں کو پہنایا جاتا ہے۔ ہم سب افسردہ اور مایوس تھے اور ہمارے چہروں پر موت کی سی اُداسی پھیلی ہوئی تھی لیکن مودودی صاحب کے بُشرے پر امید کی شفق اور تبسم کی افشاں بکھری ہوئی تھی۔ میں عالمِ حسرت و یاس میں پکار اُٹھا:۔

"مولانا! اب کیا ہوگا؟"

مودودی صاحب نے ٹھہرے ہوئے اور پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا:۔

"اللہ تعالےٰ مجھے زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت مجھ سے زندگی نہیں چھین سکتی اور اگر میرا وقت آن پہنچا ہے تو پھر مجھے کوئی بھی زندگی نہیں بخش سکتا۔ اس میں آخر گھبرانے کی بات ہی کیا ہے؟"

ان لفظوں نے میرے جسم میں ہمت و عزیمت کی برقی رَو دوڑا دی اور میں وہاں سے زندگی کی توانائیاں اور قوتیں لے کر ایک نئے عزم کے ساتھ واپس آیا۔

اس سے پہلے یہ خبر آچکی تھی کہ مودودی صاحب نے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس خبر کے کچھ دنوں کے بعد یہ خبر آئی کہ مودودی صاحب کی سزائے موت عمر قید کی سزا میں تبدیل ہوگئی ہے لیکن قدرت کی حکمتیں نرالی ہیں۔ مودودی صاحب تین سال سے پہلے ہی رہا ہو کر آگئے۔ اس وقت یہ شعر بے ساختہ میرے ہونٹوں پر آگیا تھا ؎

سزا کی طرح نئی ڈالئے کہ دیوانے
مقامِ دار و رسن سے گزر کے آئے ہیں

مودودی صاحب کی اس بلندئ کردار اور بے مثل استقامت نے میرے ذہن پر بہت گہرا اثر چھوڑا، لیکن اس تاثر پر وقت کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ تاہم ابھی ایک آدھی چنگاری باقی تھی اور اسی چنگاری کی حرارت نے میرے ذہن میں مودودی صاحب سے انٹرویو لینے کی تحریک پیدا کی۔

مودودی صاحب کے لیے سوالنامہ مرتّب کرتے وقت مجھے خاصی دقّت پیش آئی۔ وہ ایک مفکّر، عالمِ دین، ایک صاحب طرز نثر نگار و خطیب، ایک سیاسی تنظیم کے راہبر اور ایک معاشرتی مصلح کی حیثیت سے معروف ہیں اور پھر ان کی یہ ساری حیثیتیں ایک بڑی حیثیت میں مدغم ہو گئی ہیں۔ وہ بڑی حیثیت داعیِ اسلام کی ہے۔ مَیں نے پہلے فیصلہ کیا کہ سیاست کے موضوع کو گفتگو سے قطعی طور پر خارج رکھا جائے اور صرف "غیر سیاسی" باتیں کی جائیں کیونکہ ہمارے ملک کی فضا "سیاسی تذکروں" کے لیے سازگار نہیں اور ہمیں سیاست کے پیچ و خم کا شعور ہی کب ہے۔ پھر سوچا یہ ادب بھی غیر ضروری سا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں نے قوم کو بے عملی کے انجکشن لگانے کے سوا اور دیا ہی کیا ہے۔ اور اسلام ـــــ اس پر بھی باتیں سوچ سمجھ کر ہی کرنی چاہئیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ باتیں ہمارے بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہوں اور ہمارے ملکی مسائل ـــــ یہ تو سب حل ہو چکے ہیں، ان پر آخر کیا گفتگو کی جائے۔ مَیں اسی فکر میں غلطاں تھا کہ خیال کی ایک اور رَو اُبھری۔

"زندگی ایک مربوط تسلسل کا نام ہے۔ اسے اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی ایک پودے کی مانند ہے جسے اپنی نشو و نما کے لیے افکار کا رس، شعر و ادب کی شبنم، سیاست کی تمازت اور سرپھروں کا خونِ جگر درکار ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو نکال دیجیے، زندگی کا پودا مُرجھا کر رہ جائے گا۔" اس خیال کے آتے ہی مَیں نے "بھرپور" سوالنامہ مرتّب کیا اور تین نشستوں میں مودودی صاحب سے ان سوالات کے جوابات حاصل کیے۔ انٹرویو کے دوران میں ان کی شخصیت کے کئی چھپے ہوئے گوشے اجاگر ہوئے۔ ایسے گوشے جو بعض حضرات کے لیے دلچسپ ہوں گے اور بعض کے لیے مایوس کُن اور کچھ کے لیے حیرت زا۔ میرا تاثراتی احساس ان تینوں احساسات سے جُدا ہے لیکن مَیں یہ نہیں سکتا کہ اس احساس کا نام کیا ہے۔

مودودی صاحب ہمیں (میرے ساتھ تین ساتھی اور تھے) اپنے ملاقات کے کمرے میں لے گئے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کمرہ ان کا سٹڈی روم بھی ہے، آفس بھی اور لائبریری بھی ـــــ کمرے کے اندر چاروں طرف الماریاں تھیں جن میں مختلف زبانوں کی ضخیم اور نایاب کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے مرکز میں ایک بڑی میز بچھی ہوئی تھی جس پر کتابیں، رسالے اور لکھنے پڑھنے کے کاغذات ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ صاف ستھرا، خاموش اور سادہ کمرہ مکین کی کچھ صفات و خصائص کا پتہ دے رہا تھا۔ صفات اور خصائص کے خاکے میں رنگ آپ اپنے ذوق اور پسند کے مطابق بھر لیجیے، کیونکہ یہاں ایسے اشخاص کی کمی نہیں جنہیں "بے ترتیبی" میں "حسن" اور "انتشار" میں "سلجھاؤ" نظر آتا ہے اور جن کے نزدیک "قرینہ" ہی زندگی کے جسم کا سب سے بڑا ناسور ہے۔

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے مودودی صاحب سے سب سے پہلے وہی سوال کیا جو میں ہر "عظیم شخصیت" سے سب سے پہلے کرتا آیا ہوں یعنی:

"ابتدائی زندگی کے دلچسپ واقعات، والدین کی تربیت، تشکیلِ سیرت پر اثر ـــ اور بچپن کی معصوم خواہشیں۔"

مولانا نے قدرے "پس و پیش" کے ساتھ کتابِ زندگی کے چیدہ چیدہ اوراق پلٹنے شروع کیے۔

"میں نے ۱۹۰۳ء میں اورنگ آباد (انڈیا) کے مقام پر ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو برِصغیر پاک و ہند میں انگریزی طرزِ زندگی اختیار کرنے میں پیش پیش تھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے سر سید احمد خاں نے ایک "مدرسۃ العلوم" قائم کیا تھا۔ میرے والد مرحوم اس مدرسے کے اولین طلبہ میں سے ایک تھے اور وہ قدرتی طور پر سر سید کی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھے، لیکن ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیانی وقفے میں ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اس مغربی تعلیم نے ان کی زندگی کو اسلام کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اس احساس کی بدولت ان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ وہ اب مغربی تہذیب اور اس کی

اخلاقی قدروں سے سخت متنفّر ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی کو مغربی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے اس معاملے میں اتنا سخت رویّہ اختیار کیا کہ مجھے مدّت تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ انہیں انگریزی بھی آتی ہے تاہم جدید تعلیم کی وجہ سے جو خاص قسم کی ستھرائی پیدا ہوجاتی ہے، وہ آخر وقت تک باقی رہی۔

"مولانا،" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ اُن میں یہ انقلاب کیونکر آیا؟"

مودودی صاحب نے آہستہ سے کھنکھارتے ہوئے جواب دیا:

"میں قطعیت کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میرے بڑے بھائی نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، تاہم میرا یہ اندازہ ہے کہ دینی کتب کے مطالعے سے انہیں یہ احساس ہُوا کہ ہم میں کیا تغیّرات رونما ہوگئے ہیں۔"

مولانا ایک نرم رَو جُوئے آب کی مانند آگے بڑھ رہے تھے۔

"میرے خاندان کے متعلق دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اس خاندان کو سخت دشواریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے تشدّد نے اس خاندان کے افراد میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت پیدا کردیا تھا۔ اسی رچے بسے جذبے کے تحت والد مرحوم انگریزی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کے باعث میرے دل میں انگریزی ملازمت کی طرف کبھی میلان پیدا نہیں ہُوا۔

والد مرحوم میری تربیت پر خصوصی توجّہ دیا کرتے تھے۔ وہ میری زبان اور اخلاق کو معیاری، ستھرا اور پاکیزہ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصّے، تاریخِ اسلام اور تاریخِ ہند کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ وہ میری عادات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی ملازمہ کے ایک بچّے کو مارا تو انہوں نے اس بچّے کو بلا کر کہا کہ تُو بھی اسے مار۔ مجھے اس سے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عُمر میرا ہاتھ کبھی کسی زیردست پر نہیں اٹھا۔"

مولانا کے آخری لفظوں نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں نے حسرت بھری نظروں سے ماضی کے نشانات کو دیکھا۔ کتنے اچھے تھے وہ والدین! بچّوں کی تربیّت ان کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور ہماری اس نئی پود کے والدین ــــ اُف توبہ ــــ بچّوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ان کے فرائض ہی میں شامل نہیں۔ انہیں زر پرستی اور عیش کوشی سے اتنی فراغت کہاں نصیب کہ بچّوں کی ذہنی و اخلاقی درستی و اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ فلمی گانوں کی لوریاں دے کر بچّوں کو سُلاتے ہیں۔ وہ ریڈیو کی دھنوں پر مٹکتے، چٹکتے اور رقص کرتے ہیں۔ قرآن، سُنّت اور علمائے کرام کے اقوال سے بچّوں کے کان ناآشنا رہتے ہیں۔ وہ ذرا بڑے ہوتے ہیں تو نرسری اور کنڈرگارٹن کے سبز باغوں میں داخل کر دئے جاتے ہیں جہاں وہ اسلامی تعلیمات کے سوا اور سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ خوشحال گھرانوں کے بچّوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ تم حکم چلانے کے لیے پیدا ہوئے ہو اور خادموں اور ملازموں پر تشدّد کرنے ہی سے وقار اور رعب قائم رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے کتنے بچّے خداترس اور نیک سیرت انسان بن سکیں گے؟

مولانا اپنی مخصوص دھیمی آواز میں میرے سوالات کا جواب دیئے جا رہے تھے۔

آغازِ تعلیم کے متعلّق مولانا نے بتایا کہ گھر پر عربی پڑھی، سکولوں اور کالج میں مختلف علوم زیرِ مطالعہ رہے۔ انگریزی زبان میں استعداد تعلیمی دَور کے بعد حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانے کا مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ مَیں ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا اور میرے ذہن نے کبھی بھی مستقبل کا کوئی حسین خاکہ نہیں بنایا۔ البتّہ اس دَور میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

جب مَیں کالج کی تعلیم سے فارغ ہُوا تو اس وقت میری عُمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے بعد مَیں نے "آوارہ خوانی" شروع کی۔ جو کچھ ملا، پڑھ ڈالا۔ ہر موضوع اور ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت ہی خطرناک نتیجہ برآمد ہُوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اُٹھتا چلا گیا۔ تشکّک و ارتیاب سے ایمان و ایقان کی بنیادیں منہدم ہو گئیں۔ خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال

تک یہی کیفیت رہی۔

"مولانا، کیا یہ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" مَیں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں پوچھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔

"تمہیں یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

مَیں گھبرا اُٹھا مگر مولانا حالی کے اس شعر نے گھبراہٹ کو عقیدت میں تبدیل کر دیا:۔

تقاضائے محبّت ہے وگرنہ   مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

مَیں نے عالمِ شوق و جستجو میں مولانا سے دریافت کیا:۔

"اس کے بعد کیا ہُوا؟"

مولانا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا:

"تذبذب و تشکیک کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ عربی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ مَیں نے قرآن اور حدیث کا براہِ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق و معارف کھلتے چلے گئے، بے یقینی کا غبار دُھلتا چلا گیا۔ مَیں نے دوسرے ادیان کی کتابوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ ادیان کے تقابلی مطالعے نے مجھے ایک گونہ اطمینان عطا کیا۔ دراصل اب مَیں نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقانیت پر کامل یقین تھا۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے مولانا کی نگاہوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی تھی جیسے عرفان و یقین کا نُور عینک کے سپید شیشوں میں سے جھانک رہا ہو۔

"مولانا، اسلام کے پورے نظامِ حیات کو اس کے اصلی خط و خال اور وسیع مفہوم کے ساتھ سمجھنے میں قرآن و حدیث کے علاوہ آپ کو اور کونسی کتابوں نے مدد دی؟"

"ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں نے میرے ذہن کو پختہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔"

اسی موضوع پر مَیں نے ایک اور سوال کیا۔

"اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیونکر آیا؟"

مولانا ایک منٹ کے لیے خاموش رہے اور پھر اپنے دوہرے جسم کو جنبش دیتے ہوئے کہنے لگے:

"اسلام کے موضوعات اور مسائل پر لکھنے کا خیال دو باتوں کی بناء پر پیدا ہُوا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں شدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہُوا جس پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں اور اسلامی تعلیمات کے خلاف الزامات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ جذبۂ قومیت نے مجھے ان بہتان تراشیوں اور دشنام طرازیوں کے خلاف لکھنے پر اُکسایا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ مَیں باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعے ان کی تقریر سُننے کے لیے آتا تھا۔ ایک جمعے کے خطبے میں مولانا نے فرمایا کہ "اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اسلام کے صحیح تصوّرِ جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے جس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات اور الزامات کے مدلّل جوابات دیے گئے ہوں۔" مَیں نے دورانِ تقریر ہی میں یہ فیصلہ کر لیا کہ مَیں جہاد کے موضوع پر کتاب لکھوں گا۔ اس طرح اس کام کا آغاز جذبۂ قومیت سے ہُوا لیکن آگے چل کر یہ جذبہ اسلام کی وسعتوں میں جذب ہو کر رہ گیا۔"

مولانا محمد علی جوہر کا ذکر آیا تو مَیں نے ان کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا:

"مولانا، آپ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں؟ ایک طبقے کی یہ رائے ہے کہ وہ سادگی سے گاندھی جی کا فریب کھاتے رہے۔"

مودودی صاحب نے دُکھ کے ایک گہرے تاثر میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا:

"ایک شخص کے مرنے کے بعد آپ جو چاہیں اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں، لیکن درحقیقت مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں کے لیے سب سے گہرا درد رکھتے تھے۔ مَیں سمجھتا ہوں اس کے بعد سے پھر سچّا دینی جذبہ رکھنے والا لیڈر پیدا نہیں ہُوا۔ انہوں نے غلطیاں کی ہوں گی، لیکن مَیں نے بہت ہی کم لوگ ایسے دیکھے ہیں، جو اسلام

کے لیے اتنا گہرا اخلاص رکھتے ہیں۔ یہ ان جیسے لوگوں ہی کے کردار کا اثر تھا کہ کسی کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کے شعائر کا احترام اور ان پر عمل پیرا ہوئے بغیر وہ سیاسی لیڈر بن سکے۔"

مَیں نے دل میں سوچا کتنا اچھا تھا وہ دَور جو بِیت گیا۔ آج معاملہ بالکل اُلٹ ہو چکا ہے۔ "سیاستدان" کہتے ہیں: "بھلا سیاست کا دین سے کیا تعلّق ہے۔ ایک متدیّن اور متقی شخص کو سیاست کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ "سیاست کے چھینٹے" اس پاک باز انسان کے صاف ستھرے لباس کو داغدار بنا دیں۔"

بڑے بڑے لوگ اس بات کو اب اتنے زور اور بلند آہنگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ ذہن اس فلسفے کو معقول اور صحیح سمجھنے لگا ہے ع

انقلابات ہیں زمانے کے

مَیں نے سوچنا بند کر دیا اور سوالات کرنے شروع کر دیے:

"مولانا، دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟"

"شریعت میں مذہب کا لفظ مکتبِ خیال (SCHOOL OF THOUGHT) کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے لیکن دین سے مراد وہ پورا ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جو خُدا اور اس کے رسُولؐ نے ہمیں دیا ہے۔"

نظامِ زندگی کے لفظوں نے میرے رہوارِ فکر کو ایک مہمیز لگائی اور مَیں نے فلسفیانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

"زندگی مسلسل متحرک ہے۔ یہ بڑھتی، گھٹتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اس کے خول میں بے پناہ لچک ہے۔ اگر اسلام ایک نظامِ زندگی ہے تو کیا اس میں بھی لچک موجود ہے؟"

مولانا نے بے ساختگی کے عالم میں کہا: "اس میں وہ فطری لچک موجود ہے جس کا تقاضا زندگی کرتی ہے۔ اجتہاد اسی لچک کا دوسرا نام ہے۔ اجتہاد کے ذریعے سے اسلام زندگی کے ہر گُلِ تازہ کی آبیاری کرتا ہے اور

ہر نئے ابھرنے والے گوشے کو روشنی فراہم کرتا ہے۔ اسی بناء پر اسلام میں اجتہاد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور ہر زمانے میں اس کی ضرورت رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اجتہاد کو متضاد مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے۔"

یہ کہہ کر مودودی صاحب ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور مَیں نے اس وقفے میں سوال کیا:

"مولانا، وہ متضاد مقاصد کیا ہیں؟"

"اجتہاد کا ایک مقصد تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو نئے حالات پیش آئیں، ان پر اسلام کے اصول اور احکام منطبق کیے جائیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ مخصوص نظریات اور خواہشات ذہن میں پہلے سے موجود ہوں، ان کے مطابق اسلام کو ڈھالا جائے۔ پہلی قسم کا اجتہاد صحیح معنوں میں اجتہاد ہے اور ہر دَور میں علماء اس اجتہاد کے قائل رہے ہیں، لیکن مؤخرالذکر اجتہاد نہ تو اسلامی اصطلاح کے مطابق اجتہاد ہے اور نہ کوئی مسلمان اس اجتہاد کا قائل ہے۔ غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جو اس کام کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ اجتہاد کے لیے خاص قسم کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے۔"

مولانا اپنی فراخ اور کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رُکے۔ ہاتھ کی جنبشیں بتا رہی تھیں کہ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔

"مولانا، اجتہاد کے لیے کس نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہیں۔ آخر ہر شخص اجتہاد کیوں نہیں کر سکتا؟"

مَیں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے سوال کیا۔

"اس کام کے لیے بہت سی صلاحیتیں درکار ہیں، لیکن کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کے لیے مغربی قوانین، معاشیات، اقتصادیات کا علم کافی ہے اور انگریزی ترجموں سے قرآن پڑھ کر اور حدیث و فقہ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی کامیابی سے اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا اجتہاد کوئی ایسا شخص نہیں

کر سکتا ہے جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو یا جو اخلاص کے ساتھ مسلمان رہنے کا خواہش مند ہو۔ صحیح معنوں میں اجتہاد کا اہل وہ شخص ہو سکتا ہے جو عربی زبان میں مہارت رکھتا ہو، زبان کی نزاکتوں کو سمجھ سکتا ہو، قرآن کو اس کی اصل زبان میں نہ صرف سمجھنے کے قابل ہو بلکہ اپنی عمر کا غالب حصہ اس نے فہم قرآن کی نزاکتوں میں صرف کیا ہو۔ حدیث پر وسیع نگاہ رکھتا ہو، فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے اصولوں اور مختلف ادوار کے فقہا کے کام سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وقت کے مسائلِ زندگی پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔"

"مولانا،" میں نے جوش انگیز لہجے میں سوال کیا۔ "اگر ایک گروہ دوسرے قسم کا اجتہاد کرنے لگے اور اسے ملک میں نافذ کرنے پر بھی مُصر ہو، تو پھر قوم کو کیا کرنا چاہیے؟"

مولانا نے نہایت ہی پُرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا:

"پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہیے کیونکہ اِس گروہ کا طرزِ عمل لازمی طور پر ملک کو انتشار اور تباہی کے گرداب میں پھینک دے گا۔ یہ مختصر سا مغرب زدہ گروہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہے، ایک نیا دین قوم پر زبردستی ٹھونستا رہے گا اور قوم اس کو دفع کرنے کے لیے زور لگاتی رہے گی اور اس کشاکش میں ترقی کے راستے پر ہمارا قدم ایک اِنچ بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ترکی اس کا تجربہ کر چکا ہے اور اس تجربے کے بُرے نتائج وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔ اب پاکستان بھی آنکھیں بند کر کے اسی راستے پر چلنے لگا ہے۔ انجام پہلے ہی سے صاف نظر آ رہا ہے۔"

میں انجام کے بارے میں سوچ کر کانپ اٹھا۔ یاس کی کُہر نے میرے ذہن کو ڈھانپ لیا۔ اتنے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ عالمِ اشتیاق میں اس کی طرف لپکا اور اس کی روشنی میں مولانا سے ایک اور سوال کر دیا۔

"کیا اِن حالات میں علماء پر بھاری ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟"

مولانا نے قدرے توقف سے جواب دیا:

"مجھے آپ کے جذبات کی شدت کا احساس ہے مگر یہ تو سوچیئے کہ علماء اس سوسائٹی ہی کے تو فرد ہیں جس کی اخلاقی حس قریباً قریباً مر چکی ہے۔ ایسے معاشرے میں حق گو، جرأت مند باضمیر اور ایثار کیش علماء کہاں سے آئیں۔ اگرچہ علماء کا طبقہ دوسرے طبقوں کی نسبت اب بھی کئی اعتبار سے بلند ہے لیکن دین کے لیے جان کی بازی لگانے کا جذبہ بڑی حد تک سرد پڑ چکا ہے۔ کم ہمت معاشرے میں یہ جذبہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔"

میری گردن ندامت سے جھک گئی۔ ہم نے علماء کو دیا ہی کیا ہے جس کے عوض ہم ان سے کسی چیز کی توقع رکھیں۔ نہیں، نہیں، ہم نے انہیں بہت کچھ دیا ہے۔ افلاس دیا ہے، مہذب گالیاں دی ہیں اور انہیں سب سے گھٹیا معیارِ زندگی دیا ہے..... ان کے علاوہ انہیں اور کیا چاہیے؟ میرا دل بھر آیا۔ کیا علماء ایسی سلوک کے مستحق ہیں؟

رومال سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے میں نے ایک دوسرے موضوع پر سوال کیا۔

"کچھ ماہرینِ قانون کی رائے ہے کہ چونکہ سزاؤں کے تعین کے بارے میں فقہا میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لیے اسلام کا تعزیراتی نظام قابلِ عمل نہیں ہے۔ اس موضوع پر آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

مولانا نے پان کو دانتوں سے چباتے ہوئے جواب دیا:

"اگر آپ کوئی کام نہ کرنا چاہیں تو اس میں ہزاروں کیڑے ڈال سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس بات پر اتفاق کریں کہ ہم اسلام کا قانونِ تعزیرات رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کے قانونِ تعزیرات کی بنیادیں ـــ قرآن مجید کے احکام، رسول اللہ کے ارشادات اور خلافتِ راشدہ کے نظائر ہیں۔ فقہاء کے درمیان اختلافات کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسی اس زمانے میں قانون دان اور ججوں میں اختلافات ہوتے ہیں، باوجود اس کے کہ قانون ایک ہے۔ اگر یہ اختلافات موجودہ زمانے کے قانون پر عمل کرنے میں مانع نہیں ہیں تو قدیم

زمانے کے قانون دانوں اور قاضیوں کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں وہ آخر اصل قانون کو نافذ کرنے میں کیسے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اصل قانون یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اب اختلافات جو ہو سکتے ہیں وہ اس میں ہو سکتے ہیں کہ چور کی تعریف کیا ہے؟ کس حالت میں ایک شخص کو اس چوری کا مرتکب قرار دیا جائے جس پر شارع نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے؟ اس کے لیے کیا شہادت ملنی ضروری ہے؟ کونسا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ کس جگہ سے کاٹا جائے گا؟ ان امور میں جتنے اختلافات بھی ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر فقیہہ نے اصل قانون کے الفاظ اور عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر سے اپنی رائے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ جس کے نزدیک ثابت ہوا ہے، اس کو اس نے اپنی فقہ میں درج کیا ہے۔ ان چیزوں کا جو شخص بھی باقاعدہ علمی مطالعہ کرے گا، اس کو محسوس ہو جائے گا کہ جس طرح ان ماخذ سے قدیم زمانے میں قانون اخذ کیا جا سکتا تھا، اسی طرح آج بھی کیا جا سکتا ہے اور جب تک کوئی شخص اس اصل قانون کے ماخذ سے استنباط کر رہا ہے۔ اس کا اجتہاد اسلام کے دائرے ہی میں مانا جائے گا۔ مغربی تہذیب اور اس کے تصوّرات سے مغلوب زدہ لوگ جب قدیم فقہا کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور "اجتہاد" کی باتیں کرتے ہیں ان کا اصلی مدعا اسلامی قانون سے فرار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ اجتہاد کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی اسلام کو سچّے دل سے حق مانتا ہو اور اخلاص کے ساتھ اس کی پیروی کا ارادہ رکھتا ہو۔ جن "صاحب" میں یہ بنیادی شرط ہی نہیں پائی جاتی وہ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کے قانون کو مسخ کریں گے۔"

موضوع کو بدلنے کے لیے مَیں نے ایک دوسری نوعیت کا سوال کیا:

"یہ بین الاقوامیت کا دَور ہے۔ اس عہد میں مختلف تہذیبوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا بالکل فطری امر ہے۔ ان حالات میں اگر ہم مغربی تہذیب سے مصالحت (ADJUSTMENT) کر لیں تو کیا حرج ہے؟"

"تہذیبوں کے میل جول سے فعالیت اور انفعالیت کا عمل ضرور شروع ہو جاتا ہے یعنی ایک تہذیب اثر ڈالتی ہے اور دوسری تہذیب اثر قبول کرتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کونسی صورت

ہمارے لیے قابلِ قبول ہے۔ تہذیبیں برابر کی سطح پر رہ کر کبھی سفر نہیں کرتیں۔ ایک تہذیب غالب ہوتی ہے اور دوسری مغلوب۔ اس عمل میں کوئی درمیانی راہ موجود نہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو غالب رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں "مدافعت" کی سوچ بچار کی بجائے جارحانہ قدم اٹھانا ہوگا۔ وہ قومیں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا کرتیں جو اپنی حفاظت کے لیے اپنے چاروں طرف قلعے تعمیر کر لیتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تہذیب میں دنیا کی غالب تہذیب بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب اس کا انحصار مسلمانوں پر ہے کہ وہ اسے غالب تہذیب بنانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کوئی غیور اور آزاد قوم تہذیب کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا کرتی۔ قوم کی تہذیبی انفرادیت ختم ہوگئی تو پھر اس میں باقی ہی کیا رہ گیا؟ اور جو لوگ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر دوسروں کی تہذیب کو اپناتے ہیں، ان کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ کی نہیں ہے۔"

تہذیب کی بات چھڑی تو مجھے ثقافت اور کلچر کا خیال آگیا۔ اس لفظ نے دانشوروں اور مفکروں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس لیے میں نے کلچر کو موضوعِ گفتگو بنانا ضروری سمجھا۔ اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے میں مولانا سے مخاطب ہوا:

"آپ جب اسلامی ثقافت کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو منفی رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں اسلامی ثقافت میں داخل نہیں ہیں۔ آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اسلامی ثقافت میں کیا کیا داخل ہے اور اس کے تفصیلی خدوخال کیا ہیں؟"

مولانا نے میرا سوال بغور سنا اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا:

"بات یہ ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے لیے کچھ حدود مقرر کر دیتا ہے اور انسانی آزادی کو ان حدود میں محدود رہنا چاہیے۔ حدود ہمیشہ منفی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ حدود میں صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ صرف یہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد جو کچھ ممنوع نہیں ہے، وہ مباح ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے ایک فرد اپنے حسنِ ذوق کے اظہار اور نشوونما کے لیے راہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری داعیوں اور

تقاضوں پر قدغن نہیں لگائی ہے بلکہ صحت مند نشو و نما کی راہیں متعین کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی شریعت نے حیوانوں اور انسانوں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اب اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ کا ارتقاء بند ہو گیا، بلکہ مسلمانوں میں جو حسن کاری کا جذبہ تھا اس نے تصویر کا راستہ چھوڑ کر خطاطی، نقش و نگار، پچی کاری اور ایسے ہی دوسرے راستے اختیار کر لیے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان راستوں میں مسلمانوں نے جو آرٹ کے کمالات دکھائے ہیں وہ کسی طرح بھی مجسّمہ سازی کے کمالات سے کم تھے یا ان میں حسن کاری نہ تھی۔ ایسا ہی دوسرے میدانوں میں ہوا۔"

تصویروں کے بارے میں میرے ذہن میں بیک وقت کئی سوالات اُبھر رہے تھے۔ میں نے ان سوالات کو ایک سوال میں مدغم کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا:

"بعض تصویریں اپنے رنگوں کے امتزاج اور فن کار کے خونِ جگر کی آمیزش کے باعث نظر کو بالیدگی اور تازگی بخشتی ہیں۔ کیا اسلام ان کی بھی اجازت نہیں دیتا؟"

مولانا نے مسکراتی ہوئی نظریں مجھ پر جماتے ہوئے جواب دیا:

"جی نہیں، اسلام جو حدود قائم کرتا ہے، وہ اتنے واضح ہوتے ہیں کہ جن پر ہر شخص پہنچ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ میں اس کے آگے نہیں جا سکتا۔ تصویر کو ایک مرتبہ جائز کرنے کے بعد پھر کوئی خط کسی مقام پر بھی نہیں کھینچا جا سکتا کہ اس نوعیت کی تصاویر جائز ہیں اور اس نوعیت کی نہیں۔ ایک شخص عورت کی ننگی تصویر کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے اس کی روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ یوں تو پھر آپ کو عریانی کے تمام مظاہر کو جائز قرار دینا پڑے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ مولانا بھی کمال کرتے ہیں۔ آخر عریاں تصویر میں حرج ہی کیا ہے۔ ان تصویروں سے ذوق نکھرتا ہے، بزنس چمکتا ہے، اشتہارات دیدہ زیب نظر آتے ہیں۔ ہوٹلوں اور دوکانوں کا حُسن بڑھتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہراہوں کے چوراہے ان تصاویر کی آرائش سے پیرس کے چوراہے نظر آتے ہیں۔ تو کیا مولانا اسلام کے نام پر ہم سے یہ سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔ ہم "نوجوانوں" کا کیا بنے گا؟ یہ کائنات

بے رنگ ہو جائے گی۔

خیالات کے سیلاب و گرداب سے اُبھرتے ہوئے مَیں نے مولانا سے ایک اور سوال کیا:

"کیا اسلامی ریاست میں سینما کو اصلاحی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے گا؟"

"سینما کی موجودہ شکل تو نہایت ہی اخلاق سوز اور تباہ کن ہے۔ وہ یوں کہ فلم کمپنیاں سُودی قرض سے سرمایہ حاصل کر کے کام آگے بڑھاتی ہیں۔ سرمایہ دار کا سُود اور اپنا نفع، دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لیے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ وہ ایسے فلم بنائیں جو افیون اور شراب کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچیں۔ یہ فلم لامحالہ جنسی یا جرائم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جو فلم اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے بنائے جائیں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اسلامی ریاست اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لیے سینما استعمال کر سکتی ہے۔ فلم کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو ہمارے دیہاتی کے معیارِ معلومات کو گریجویٹ کے معیار تک لایا جا سکتا ہے، لیکن یہ کام اسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب آنکھوں سے پلائی جانے والی شراب کو بند کیا جائے۔ اب جو ٹیلی ویژن آ رہا ہے اس نے اور بھی قیامت ڈھا دی ہے۔ مغربی ممالک میں بسا اوقات تو ایسا ہُوا ہے کہ ایک بڑے بچے نے قتل کا منظر دیکھ کر چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ جو مناظر پہلے فلم سکرین تک محدود تھے، اب وہ گھر بیٹھے دیکھے جا سکتے ہیں۔"

مولانا بات کرتے کرتے رُک گئے۔ ان کا لہجہ غم اور دردمندی کے جذبات میں ڈوبتا ہُوا محسوس ہُوا۔ وہ تاریخ کے جھروکوں سے ماضی اور حال کا مشاہدہ کرتے ہوئے مستقبل کے اُبھرتے ہوئے دھیمے دھیمے نقوش دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یقین و وجدان کی الم آمیز کیفیت کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"آج پوری انسانیت دو چیزوں کی وجہ سے تباہی کے قریب آتی جا رہی ہے۔ ایک سُودی کاروبار اور دوسری خاندانی منصوبہ بندی۔ اِن دونوں باتوں نے انسان کو نہایت ہی گھٹیا حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اُسے مادیت کا غلام بنایا اور دوسری نے جنسی خواہشات کا۔ مجھے دُکھ ہے کہ یہ دونوں بلائیں میرے ملک کی طرف بڑھ رہی ہیں اور انہیں ہم خود خوشی خوشی لا رہے ہیں۔"

مجھے پہلی بار یہ احساس ہُوا کہ مولانا بھی جذبات رکھتے ہیں، مگر ان جذبات میں توازن تھا اور یہی توازن ان کے جذبات کو شورش کی آماجگاہ بننے نہیں دیتا۔

لیکن میرا سینہ جذبات کا محشرستان بنا ہُوا تھا۔ مَیں نے سنبھلتے ہوئے نئے سوال کے لیے الفاظ جمع کرنے کی کوشش کی۔

"زندگی میں آسائش و زیبائش پیدا کرنے کے لیے اسلام ایک فرد کو کس حد تک جانے کی اجازت دیتا ہے؟"

مولانا نے کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان استعمال کرتے ہوئے جواب دیا:

"اسلام نہ آسائش کا مخالف ہے اور نہ زیبائش کا۔ حدود میں رہتے ہوئے آپ زندگی میں یہ دونوں باتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ دراصل اسلام ضرورت کے پیمانوں کے مطابق آپ کو تمام مباحات استعمال میں لانے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ آپ کے طرزِ عمل سے اسراف اور کبر نہ ٹپکتا ہو۔ ضرورت کے لیے آپ دو منزلہ کوٹھی بھی بنوا سکتے ہیں اور اگر فی الواقع ضرورت ہو تو دروازوں پر پردے بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن اگر آپ بلا ضرورت صرف نمائش کے جذبے کے تحت زندگی پر تکلّف کے قیمتی غلاف چڑھانے لگیں تو اس عمل کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

"لیکن، مولانا، یہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جب انسان آسائشوں میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو پھر اس میں دین کے لیے جدوجہد کرنے کا احساس اور جذبہ بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ان آسائشوں سے احتراز کریں؟"

مولانا سوال سُن کر ایک منٹ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر فکر آمیز متانت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے:

"نہیں، الطاف صاحب، یہ مناسب نہیں۔ اسلام میں جو حدود مقرر ہیں ہم ان میں اضافہ نہیں کر سکتے۔

اصول کی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مباح چیزیں استعمال میں لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن کسی ایک فرد کو اگر مباح چیز اسلام سے دُور لے جاتی ہے، تو وہ اس کے لیے ممنوع قرار پاتی ہے۔ مثال کے طور پر کوٹ اور پتلون کی کریز ٹوٹنے کا خیال اگر کسی کو نماز ادا کرنے سے باز رکھتا ہے تو یہ لباس اس کے لیے ممنوع قرار پائے گا۔ آسائشوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ زندگی کی آسائشیں، مسرّتیں اور جائز لذّتیں ہمارے لیے ہیں، لیکن اگر یہ ہمیں اسلام کے راستے سے ہٹانے کا سبب بنتی ہیں، تو انہیں ٹھکرا دیجیے۔ اس بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسان کے معتقدات پختہ ہوں تو یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہوا کرتیں۔ جس شخص کے سامنے مقصدِ زندگی ہوتا ہے اس کے لیے اصل چیز آسائش نہیں ہوتی، اصل چیز اس کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے۔ آسائشیں جب تک مقصدِ زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں، وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جس وقت حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، وہ لات مار دیتا ہے۔ جب آسائشوں اور مقصدِ زندگی میں تصادم ہو جائے تو پھر آسائشیں اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔"

مولانا کی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کا مقصدِ زندگی آسائشوں کا حصول ہے اور جب ان آسائشوں پر ذرا سی بھی آنچ آنے لگتی ہے تو پھر یا تو ہم معتقدات کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں یا ذرا اصول پسندی سے کام لیا تو ان معتقدات کو تاویلوں کے ذریعے آسائشوں سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی اغماض نہیں برتا جا سکتا کہ ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والے جہاں ایک طرف غریبوں اور عوام کی زندگی کے مسائل سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور ان کی ایثار کیشی دھندلا جاتی ہے وہاں دوسری طرف ان کی آسائشوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک مقام یہ آتا ہے کہ وہ معیارِ انسانیت (STANDARD OF HUMANITY) کی بجائے معیارِ زندگی STANDARD OF بلند کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا مقصود بن کر رہ جاتا ہے۔

مولانا کے اس فقرے نے مجھے چونکا دیا۔

"قریشی صاحب، آپ کس گہری سوچ میں ہیں؟"

مَیں گھبرا اٹھا جیسے چوری کرتا ہُوا پکڑا گیا ہوں۔ پسینے کے قطرے میرے پیشانی پر اُبھر آئے۔ انھیں رومال سے پونچھتے ہوئے مَیں نے مولانا سے ایک نئے موضوع پر سوال پُوچھا۔

"عالمِ اسلام میں جو ایک انتشار اور شکست خوردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟"

"یہ تو ایک نہایت ہی طویل داستان ہے۔ اِسے اِس موقع پر کیونکر دُہرایا جا سکتا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگے:

"دراصل انتشار کی بڑی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی قیادت ایک مدّتِ دراز سے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو اسلام کو ماننے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام کے حدود میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قیادت کا ایک حصّہ علماء، فقہا اور صوفیاء کے ہاتھوں میں رہا ہے مگر اس نے صرف بریک کا کام دیا ہے۔ گاڑی چلانے والی لیڈرشپ دنیا پرستوں کے ہاتھ میں رہی اور اسی نے بگاڑ کو یہاں تک پہنچایا ہے۔ جب تک گاڑی کو چلانے والی لیڈرشپ دیندار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئے گی، اس وقت تک یہ حالت نہیں بدل سکتی۔ بعض مسلمان ملکوں میں تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ بریک ٹوٹ چکا ہے اور ڈرائیور گاڑی کو بگٹٹ نشیب کی طرف لے جا رہے ہیں اور اکثر مسلمان ممالک میں بریک کمزور پڑ چکے ہیں۔"

آہ! جن گاڑیوں نے کبھی بلندیوں کو سر کیا تھا، آج وہ نشیب کی طرف لڑھک رہی ہیں اور ہم تماشائی کی حیثیت سے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہیں اور ہم میں احساس کی ذرا سی بھی خلش پیدا نہیں ہوتی۔

مَیں نے پہلو بدلتے ہوئے مولانا سے سوال کیا:

"اِس صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کیا کوئی متحدہ کوشش نہیں کی جا سکتی؟"

مولانا نے یاس اور امید کے ملے جلے جذبات کو اپنے لہجے میں سموتے ہوئے جواب دیا:

"متحدہ کوشش سرِ دست تو صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں میں دینی رُوح کو بیدار کرنے والے لوگ کام کرتے رہیں اور جب کبھی موقعہ ملے تو ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے اس وقت کے بین الاقوامی حالات کوئی موقعہ نہیں دے رہے ہیں۔ تمام مسلمان ممالک پر ایسے لوگ مسلّط ہیں جو ایک طرف مغربی نیشنلزم کے تصورات کی پیروی کر کے اپنے اپنے ملکوں کو مضبوط فولادی سرحدوں میں محصور کیے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی مسلم تحریک نہیں چل سکتی اور دوسری طرف وہ مغربی تہذیب و تمدن کو اپنے ملکوں میں رواج دے رہے ہیں اور اس طرح وہ اسلامی تحریکوں کے راستے میں سخت رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

مؤتمرِ عالمِ اسلامی کی تازہ کانفرنس جو جدہ میں ہوئی ہے اس سے کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ دراصل حج کے دنوں میں پورے عالمِ اسلام کے مدبرین اور علماء کو سر جوڑ کر مل بیٹھنے کا سب سے موزوں موقعہ میسّر آتا ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ باہمی ربط سے بے شمار فوائد وابستہ ہیں جن کی بدولت کام کی اَن گنت راہیں نکل سکتی ہیں۔ اس وقت عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایسے لٹریچر کی ہے جو اٹھنے والے مختلف مسائل کا نہایت ہی صاف معقول اور قابلِ عمل حل پیش کر سکے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کچھ ممالک کی درس گاہوں میں بعض کتابیں نصاب میں داخل ہو گئی ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ وہاں کے نوجوان بالخصوص انگریزی یافتہ طبقے کو متاثر کر رہی ہیں۔ ان کتابوں میں عرب نیشنلزم پر بھرپور تنقید کی گئی ہے اور شاید یہ اسی کا اثر ہو کہ عرب ممالک میں عرب قومیت کے خلاف تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہی تحریک آگے چل کر اسلامی تحریک کے لیے راستہ ہموار کر دے۔"

مولانا بات ختم کر چکے تو میں نے اسی موضوع پر ایک اور سوال کر دیا:

"آپ نے عرب ممالک کی سیاحت کی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا اس سرزمین سے کسی اصلاحی اور جمہوری تحریک کے اٹھنے کی توقع نہیں؟"

مولانا نے جواب میں فرمایا:

"وہاں کے حالات کے اعتبار سے اس وقت کسی جمہوریت کے قائم ہونے کے امکانات روشن نہیں ہیں۔ تقریباً تمام عرب ممالک میں آمریتیں قائم ہیں۔ عراق، سوڈان اور مصر میں آمریت ہے۔ تیونس بھی قریب قریب آمریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اُردن، مراکش اور لیبیا میں بادشاہی نظام قائم ہے۔ شام میں جمہوریت سر اُٹھاتی ہے اور فوجی آمریت اسے بار بار پچھاڑ دیتی ہے۔ جمہوریت اس وقت عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں۔ سیاسی رقابتوں کی بناء پر ایک ملک دوسرے ملک میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ جمہوریت کا علمبردار خود اپنے ملک میں آمریت چلا رہا ہوتا ہے۔ تمام مسلم ممالک کا قریب قریب یہی حال ہے کہ ان ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے ملک کو فتح کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔"

عالمِ اسلام پر تفصیلی گفتگو کے بعد پاکستان کے مسائل زیر بحث آئے۔ مَیں نے پاکستان کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور یہ میرے سوالات کی آخری کڑی تھی۔

"آپ کے نزدیک اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ کیا ہے اور اسے کس طرح حل کیا جاسکتا ہے؟"

مولانا نے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے جواب دیا:

"میرے نزدیک پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ تقریباً وہی ہے جو تمام مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخر کار لیڈر شپ آیا اسلام کو ماننے، سمجھنے اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں آتی ہے یا ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے یا کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی قوم کو بگٹٹ غیر اسلامی راستے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر مستقبل قریب میں اس مسئلے کا فیصلہ پہلی صورت کے حق میں نہ ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ سارے مسلم ممالک سخت تباہی سے دوچار ہوں گے۔ بدقسمتی سے بیشتر مسلم ممالک میں جو لیڈر شپ قائم ہے وہ کسی عنوان بھی مسلم عوام کے ضمیر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ حکومتیں اگر سو برس بھی زور

لگائیں تو بھی میں توقع نہیں رکھتا کہ وہ مسلم عوام کے عقائد اور ان کے تصورات، تہذیب و تمدن اور ان کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کر سکیں گی۔ اور میں یہ بھی توقع نہیں رکھتا کہ مزید سو برس میں وہ کسی دوسری تہذیب کی قدروں اور تصورات پر قوم کی تعمیر سیرت کر سکیں گی۔ اس کشمکش کا حاصل اس سے زائد کچھ ہوتا نظر نہیں آتا کہ مسلمان قوم کی کوئی سیرت اور کردار نہ بن پائے اور اخلاقی اعتبار سے وہ بالکل دیوالیہ ہو جائے اور کوئی مادی ترقی بھی نہ کر سکے۔ ایک بے سیرت قوم، خواہ کتنے ہی ذرائع و وسائل رکھتی ہو، درحقیقت کوئی مادی ترقی نہیں کر سکتی اور کسی حکومت کی کوئی پالیسی خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی ایسی صورت میں کامیاب نہیں ہو سکتی جبکہ پوری قوم کا ضمیر پورے اطمینان کے ساتھ اس کے ساتھ نہ ہو۔ اس لیے میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام مسلمان ملکوں کے مستقبل کا انحصار صرف ایک صحیح قسم کی اسلامی لیڈر شپ پر ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ قیادت میسر نہ آئی تو ہم سب کو بہت ہی برا دن دیکھنا پڑے گا۔"

"اس لیڈر شپ کو تیار کرنے کے لیے کس شعبے میں اصلاح درکار ہے؟" میں نے مولانا سے استفسار کیا۔

"لیڈر شپ کسی ایک شعبے میں نہیں ابھرا کرتی۔ اس کو زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر اور نمایاں ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان ملکوں میں جمہوری نظام کو نشو و نما پانے کا موقع مل جائے تو بالکل ایک فطری ارتقاء کے طور پر مسلمان ملکوں میں اسلامی لیڈر شپ ابھر آئے گی۔ مغرب زدہ طبقہ ہر مسلمان ملک میں ایک بڑی ہی محدود اقلیت رکھتا ہے لیکن مغربی استعمار کی بدولت یہ اقلیت اقتدار کی وارث بن گئی ہے۔ یہ طبقہ اس بات کو جانتا ہے کہ اگر ان ملکوں میں جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملا تو آخر کار اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اس لیے یہ طبقہ سازشوں کے ذریعے آمریت قائم کر رہا ہے اور جمہوریت کو ابھرنے کا موقع نہیں دے رہا ہے۔"

"لیکن مولانا! مسلمان جمہور خود اسلام کے راستے سے بہت دور ہیں۔ انہیں اسلام سے جذباتی لگاؤ تو ہو سکتا ہے مگر غالباً تربیت کی کمی کی وجہ سے ان میں وہ جوہر نظر نہیں آتا جو اسلامی لیڈر شپ کو جنم دے سکے۔ تو پھر جمہوری نظام قائم کرنے سے صالح قیادت کیسے بروئے کار آ سکے گی؟"

مولانا نے ایک متفکر کے سے انداز میں جواب دیا:

ان دونوں کی حالت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ اگرچہ ان میں جہالت بھی بہت پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں۔ کسی بُرے سے بُرے بدکردار آدمی سے آپ بات کریں تو تھوڑی دیر بعد آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس کی قدریں (VALUES) ابھی وہی ہیں جو ایک مسلمان کی ہونی چاہییں اور اپنی تمام بدکرداریوں کے متعلق اسے یہ تسلیم کرنے میں تامّل نہ ہوگا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ بُرائی کو بھلائی کہنے والے آدمی عوام میں آپ کو بہت ہی مشکل سے ملیں گے۔

اس کے برعکس مغرب زدہ طبقے کی قدریں (VALUES) تبدیل ہو گئی ہیں۔ ان کا فلسفۂ زندگی بدل گیا ہے۔ اسلام جن چیزوں کو بُرا کہتا ہے وہ انہیں اچھا سمجھتے ہیں اور اسلام جن چیزوں کو نیکیوں سے تعبیر کرتا ہے ان کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں نہیں ہے۔ اسلامی روایات سے وہ منحرف ہو چکے ہیں بلکہ ان کی نگاہوں میں ان روایات کے لیے کوئی احترام نہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں جو پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں، اُن میں سے اکثر اس خیال کے حامی ہیں کہ تاریخ انسانی میں مسلمانوں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سر انجام نہیں دیا۔ ایسے استاد بھی ہماری درسگاہوں میں موجود ہیں جو فرائڈ کے نظریات کے مطابق انبیائے کرام اور ہمارے رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی تصریح فرماتے ہیں۔ اونچے سرکاری مناصب پر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو شراب اور سُود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رقص و سرود کو اسلامی تہذیب و ثقافت قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے عقائد اور عوام کے درمیان کوئی بھی مماثلت نہیں۔ اگر اقتدار اسلامی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان عوام کو صرف چند سالوں میں بالکل تبدیل کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے رگ و ریشے میں اسلامی تصوّرات اور اقدار موجود ہیں۔ صرف ان کو اُبھار کر عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"مولانا، خدا کرے آپ کا حسنِ ظن درست ہو۔ حالات تو کچھ اور ہی اشارے کر رہے ہیں۔"

مولانا نے شفقت اور امید میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔ ہم نے مولانا سے اجازت لی۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھے۔ جو ٹھہراؤ، شفقت کی نرمی اور زندگی کی حرارت مولانا کے چہرے سے ٹپک رہی تھی وہی ہاتھ میں جذب تھی۔ واقعی تعمیری کاموں کے لیے انہی کی ضرورت ہے۔

مولانا سے اَن گنت سوالات کرنے کے بعد ایک سوال مَیں نے اپنے آپ سے کیا؛

"تم ان لوگوں کے زمرے میں تو نہیں آتے جو اسلام کو مانتے ہوئے اس کے حدود میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟"

سوال ڈائریکٹ تھا۔ اس کی تندی اور تلخی کی تاب نہ لا سکا۔ مَیں بوکھلا اُٹھا۔ بے حسی کے سحر نے جاگے ہوئے ضمیر کو یہ کہہ کر سُلا دیا کہ اس نوعیت کے سوالات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ ایسی باتیں بڑھاپے میں اچھی لگتی ہیں۔

جوانی کی شمشیرِ خارا شگاف نے احتساب کی تلوار کو کُند کر کے رکھ دیا اور مَیں سوچنے لگا نامعلوم روزانہ اس طرح کتنی تلواریں کند ہوتی ہوں گی اور کتنے ضمیر بے حسی کی نیند سو جاتے ہوں گے۔

اے۔ کے۔ بروہی

یہ ۵۴-۱۹۵۳ء کا ذکر ہے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی جذبات کی حدت سے کوہِ آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔ دستور کا مسودہ زیرِ بحث تھا اور وہ لوگ جو پاکستان کو اسلامی ریاست کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے، وہ دستور کی اسلامی دفعات اور اس کی مذہبی حیثیت پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ مسٹر اے۔ کے بروہی اس وقت وزیرِ قانون تھے۔ انہوں نے نہ صرف ان حملوں کا دنداں شکن جواب دیا بلکہ اسلامی نظامِ سیاست کا دوسرے نظامہائے حکومت سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ہمارے لیے یہی نظام سب سے بہتر ہے۔

۱۹۵۴ء کے ابتدائی مہینوں میں قانون ساز اسمبلی نے ایک بل پاس کیا جو مسٹر اے۔ کے۔ بروہی کے نزدیک اس لیے غیر قانونی تھا کہ اسے پیش کرتے اور پاس کرتے وقت قانون ساز اسمبلی کے ضابطے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسی اصولی اختلاف پر انہوں نے وزارتِ قانون سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مثال تھی جس میں اصول کی خاطر اقتدار کو ٹھکرا دیا گیا تھا۔

اس کے بعد اس ملک میں پے در پے سیاسی اور نظریاتی انقلابات آئے۔ تغیرات کی برق رفتاری کا

یہ عالم تھا کہ اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ ابھرتے ہوئے نئے مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا جا سکے۔ نئی نئی شخصیتیں ابھرتیں، ڈوبتیں اور ڈوب کر پھر ابھرنے کی کوشش کرتیں۔ شخصیات کی اس شعبدہ بازی نے ذہن پر اتنے تازہ نقوش مرتسم کر دیئے تھے کہ پرانے نقوش "لاشعور" کی تہوں میں دب کر "نیم مردہ" ہو گئے تھے۔ اتنے میں مشتاق گورمانی اور زیڈ۔ اے سلہری ڈرامائی انداز میں عدالت کی سٹیج پر نمودار ہوئے اور اہلِ ملک کی نگاہیں اس ڈرامے کے مختلف اداکاروں پر جم کر رہ گئیں۔ اس ڈرامے کے اتار چڑھاؤ اور پیچ و خم میں ایسی ایسی صورتیں پنہاں تھیں کہ یہ شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ ذہنی افق پر ابھر آیا ؎

داورِ محشر! میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ\
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

مَیں اس مقدمے کی پوری روداد کو بڑے غور اور انہماک سے پڑھتا تھا۔ عدالت میں ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ پیش ہوا جس کے مشاہداتی نتائج پر سارے مقدمے کا دار و مدار تھا۔ وہ آیا اور اس نے مشتاق احمد گورمانی کے خلاف اپنی رپورٹ پیش کی۔ مقدمہ بتدریج گورمانی صاحب کے خلاف جا رہا تھا اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات کہیں کہیں پر حیرت اور کہیں کہیں پر یقین کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی طرف سے مسٹر بروہی وکالت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مسٹر اے۔ کے۔ بروہی نے ہینڈ رائٹنگ ایکسپرٹ پر جس ذہانت اور فکری اپچ کے ساتھ جرح کی اس نے نہ صرف مقدمے کی صورتِ حال کو یکسر بدل کر رکھ دیا بلکہ ملک کے ذہین طبقے میں بروہی صاحب کے لیے ایک انفرادی مقام پیدا کر دیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ سندھ کے صحرا میں پلا ہوا جسم اپنے اندر نہایت ہی زبردست دماغ رکھتا ہے۔

ان تاثرات کی بناء پر مدت سے خواہش تھی کہ صاحبِ موصوف سے انٹرویو لیا جائے لیکن ان کا نشیمن کراچی میں ہے اور سنا ہے کہ وہ مقام ایسا ہے جہاں ہم جیسے "طائرانِ لاہور" کے پر جلتے ہیں۔

یہ ۱۹۶۱ء کے آخری مہینوں کی بات ہے کہ بروہی صاحب لاہور تشریف لائے۔ مجھے معلوم ہوا

مَیں نے ان کی جائے قیام کا پتہ چلانا چاہا لیکن لاہور میں کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو اس نوع کی معلومات بہم پہنچا سکے۔ مَیں نے ہمت نہ ہاری اور آخر میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس وقت بروہی صاحب، وقار النساء نون کے ہاں مدعو ہیں۔ ایک خیال آیا کہ وہاں فون کر لیا جائے لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال گزرا کہ کھانے کے وقت بڑے لوگوں کی نشاط آگیں دنیا میں داخل ہونا اچھا نہیں، لیکن معلوم نہیں مجھے بروہی صاحب کی شخصیت پر اُن دیکھے اتنا اعتماد کیوں تھا کہ مَیں نے بے ساختگی کے عالم میں ٹیلیفون کا ڈائل گھمایا۔ گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے آواز آئی :

"بروہی سپیکنگ" (بروہی بول رہا ہے)

مَیں نے جواب میں اپنا تعارف کرایا اور ساتھ ہی اپنی خواہش کا اظہار اس بے تکلفی سے کیا کہ جیسے وہ میرے برسوں سے واقف ہیں۔ تین چار منٹ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ بروہی صاحب کے آخری الفاظ یہ تھے :

"قریشی صاحب، مَیں آپ کو ضرور انٹرویو دوں گا، کیونکہ آپ کی باتوں میں خلوص، شوق اور جرأت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ مَیں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب جب کبھی مَیں لاہور آیا، آپ کو ضرور اطلاع دوں گا۔"

مَیں نے شکریہ ادا کیا۔ انتظار میں پانچ ماہ بیت گئے۔ انتظار کی لذت میں کتنی حلاوت ہوتی ہے۔ آخر کار یہ مرحلہ بھی سر ہُوا اور اپریل کی ستائیس تاریخ کو مجھے بروہی صاحب سے فون پر دوبارہ ملنے کا اتفاق ہُوا۔

مَیں نے انہیں وعدہ یاد دلایا، کہنے لگے :

"ہاں ہاں مجھے خوب یاد ہے، کل آٹھ بجے آجائیے۔"

اگلی صبح پورے آٹھ بجے ہم گورنمنٹ کالج لاج کے سامنے تھے۔ بروہی صاحب نے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ وہ ناشتہ کر رہے تھے۔ ہمیں اپنے قریب بٹھایا۔ چائے پیش کی۔ ہم نے کہا ہم ابھی [illegible] آئے ہیں۔ وہ مسکرا دیے۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ جس میں شفقت کی مٹھاس اور محبت کی چاشنی تھی۔ (بشکریہ اردو ڈائجسٹ)

پیش کیا تو ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

بروہی صاحب چائے کی پیالی بنانے میں مصروف ہو گئے۔ اس عرصے میں مَیں نے ان پر نگاہ کا بھرپور وار کیا۔ مَیں نے اس سے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ اٹھتا ہوا قد مگر اتنا دراز نہیں کہ اسے سرو سے تشبیہہ دی جا سکے۔ سرو کی تشبیہہ تو ویسے بھی میرے ذوقِ نظر پر گراں گزرتی ہے۔ وہ محبوب جس کا قد سرو جیسا ہو اس سے تو خوف آتا ہو گا۔ سانولا سا رنگ جو یورپی ممالک میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ کشادہ پیشانی جس کی سلوٹوں میں طوفان ٹھٹھرے ہوئے ہیں۔ گہری اور چمکیلی آنکھیں جن سے آتشِ شوق برستی ہے۔ جسم میں ایسی پھرتی جیسے بجلیاں کوندرہی ہوں۔ مَیں ابھی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اتنے میں دفعتہً بروہی صاحب نے ہم سے سوال کیا:

"آپ کے خیال میں اردو زبان کے ارتقاء اور فروغ کی رفتار تسلّی بخش ہے؟"

"موجودہ رفتار کو بہت زیادہ تسلی بخش تو نہیں کہا جا سکتا البتہ وہ حوصلہ افزا ضرور ہے۔ مختلف ادارے اور افراد اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ اگر حکومت اس طرف اور زیادہ توجہ دے تو کام کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔" مَیں نے جواب میں کہا۔

"حکومت کی توجہ" انہوں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "علم و ادب کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہم پر یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ جب کبھی علم و ادب کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی، اس کی روح اور تازگی ختم ہو گئی۔ میرے خیال میں حکومت ان معاملات میں جتنا کم دخل دے، اتنا ہی اچھا ہے۔

"لیکن بروہی صاحب، حکومت کو ایسا ماحول پیدا کرنے میں مدد کرنی چاہیئے جس میں اردو زبان زیادہ تیزی سے پروان چڑھ سکے۔" مَیں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس حد تک تو ٹھیک ہے ــــ مگر مَیں اس کو بھی بہت زیادہ پسند نہیں کرتا۔" یہ بروہی صاحب کے الفاظ تھے۔

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"ادیبوں اور شاعروں کو کسی سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ ان کے مفادات کے تحفظ کے نام پر جو ادارے حکومت کے سائے میں قائم ہوتے ہیں، مَیں انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ادبِ عالیہ خوشحالی اور عیش کوشی کی فضا میں جنم نہیں لیا کرتا۔ زندگی کی حسرت و نامرادی، حالات کی پیہم کشمکش اور مصائب و حوادث کے اتار چڑھاؤ، فن کار کی روح میں سوز، تڑپ اور درد کی وہ لہریں پیدا کرتے ہیں جو خونِ جگر میں تحلیل ہو کر فن کی تخلیق کرتی ہیں۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو مَیں ان ادیبوں اور فن کاروں سے زندگی کی تمام آسائشیں چھین لوں اور انہیں زندگی کی ویرانیوں میں سرگرداں رہنے کے لیے چھوڑ دوں۔ ایسے ماحول میں جو ادب تخلیق پائے گا اس میں تاثیر ہوگی، اس میں عزم ہوگا، جرأت اور بے باکی ہوگی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں خلوص اور دردمندی ہوگی۔"

بروہی صاحب گاہے اُردو گاہے انگریزی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ اردو زبان میں سندھی لہجے کی آمیزش کر جاتے تو اندازِ گفتگو میں اور زیادہ مٹھاس پیدا ہو جاتی۔ ایک دفعہ جب انگریزی زبان میں باتیں کرنے لگے تو رک گئے اور ہم سے پوچھنے لگے:

"آپ انگریزی سمجھ لیتے ہیں؟"

مَیں اس سوال پر تلملا اٹھا۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا: "اردو سمجھ میں آئے نہ آئے، انگریزی سمجھ لیتا ہوں۔"

انگریزی بڑی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔

بروہی صاحب اب تک ادیبوں کے بارے میں جو کچھ کہہ چکے تھے، اس سے میرے ذہن میں بھی کئی سوال ابھر آئے تھے۔ مَیں خیالات کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔ معاملے کی وضاحت کے لیے مَیں نے بروہی صاحب سے سوال کیا:

"اس سے تو آپ اتفاق کریں گے کہ ادیب بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے اسے

بھی روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر معاشرہ ادیبوں کو بہتر معاشی اور معاشرتی مقام دینے کی طرف توجہ نہ دے تو ایسے حالات میں حکومت ان کی بہتری کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟"

بروہی صاحب نے چائے کا ایک جرعہ لیتے ہوئے کہا:

"سخت نقصان وہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اشتراکی ملکوں میں کیا ہوتا ہے، جب کوئی نئی قیادت برسرِ اقتدار آتی ہے تو سب سے پہلے ان ادیبوں اور شاعروں کو، جو قوم کے ذہنی قائد ہوتے ہیں، رام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اکرام و عنایات کے برقی تار ان کے گرد بچھا دیے جاتے ہیں اور جب بٹن دبایا جاتا ہے، تو ان ذہنی قائدین کی روح اس طرح کھینچ لی جاتی ہے جس طرح اس بدنصیب کی جسے موت کی کرسی پر بٹھا کر برقی تاروں سے جکڑ دیا گیا ہو۔ پھر یہ ادیب وہ بات نہیں کہتے جو اندر سے ابھرتی ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں جس کا اوپر سے اشارہ ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک حریت پسند اور غیوّر قوم کے لیے پیغامِ موت ہے۔ کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" مَیں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

میرے ساتھی نے بروہی صاحب سے ایک اور موضوع پر گفتگو کا آغاز کیا:

"بروہی صاحب، مغربی تہذیب جس تیزی سے ہم پر اثر انداز ہو رہی ہے، آپ کے خیال میں اس کے کیا نتائج نکلیں گے؟"

بروہی صاحب نے وکیلوں کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھے سب سے پہلے "مغربی کلچر" اور "مشرقی کلچر" کی اصطلاحوں سے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک کلچر نہ مشرقی ہے نہ مغربی، ہماری کوتاہ بینی نے خود ہی حدیں قائم کر لی ہیں۔ میری نظر میں یہ سب ایک ہی تہذیب ہے، جسے مَیں انسانی تہذیب کے نام سے موسوم کیا کرتا ہوں۔ تہذیب پوری انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صرف اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی اور تحریک ہے جس نے انسانی تہذیب کا سب سے زیادہ صحیح تصور پیش کیا اور وہ فکری بنیادیں فراہم کیں جن پر آفاقی معاشرے کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔"

"وہ فکری بنیادیں کیا ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

بروہی صاحب نے نپے تلے الفاظ میں کہنا شروع کیا:۔

"دنیا میں جتنے کلچر موجود ہیں ان کی بنیاد خون اور جغرافیائی حدبندی پر ہے، اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ اسلام نے ان حدبندیوں سے بلند ہو کر انسان کو زندگی کا آفاقی تصور دیا۔ ایک ایسا تصور جس میں نسل اور وطنیت کی مکمل نفی ہے۔ قرآن حکیم کے یہ الفاظ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین خونی تعلقات کی نفی کرتے ہیں۔ یعنی ان میں یہ کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے ساتھ خونی رشتہ نہیں، بلکہ ان کا انسانیت کے ساتھ صرف روحانی اور دینی تعلق ہے۔ بعینہٖ اسلام کی پوری سکیم میں وطنیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اسلام میں "ہجرت" کا تصور اور اس کا عملی نظام انسانیت کو وطنیت کی تنگنائیوں سے نکال کر آفاقیت کی وسعتوں میں داخل کر دیتا ہے۔ ان دونوں بنیادوں کو ڈھا دینے کے بعد اسلام وہ مثبت قدر مہیا کرتا ہے جو انسانیت کو متحد اور منظم کرتی ہیں، اور وہ ہے تقویٰ اور ضبطِ نفس ــــ جس نسبت سے آپ اتقاء کی ارفع منازل طے کرتے چلے جائیں گے، اسی نسبت سے آپ کی زندگی میں پاکیزگی، طہارت اور صالحیت آتی چلی جائے گی، اور یہی تہذیب کا اصلی جوہر ہے۔"

انگریزی لباس میں ملبوس بروہی صاحب نے جب صالحیت اور تقویٰ کے الفاظ استعمال کیے تو میں بھونچکا سا رہ گیا۔ ایک ماڈرن انسان کے نزدیک ان لفظوں کے بھی کچھ معنی ہیں! ہم نے تو اکثر یہی دیکھا ہے کہ جس شخص نے انگریزی ادب کی دو چار کتابیں پڑھ لیں اور وہ ایک دو بار یورپ کی سرزمین کو چھو آیا، اسے اسلام ایک فرسودہ مذہب نظر آنے لگا جو آج سے صدیوں پیشتر صرف عرب کے صحراؤں میں ہی پھل پھول سکتا تھا۔ اب وہ ایک قصۂ پارینہ ہے جسے اس عہد میں دہرانا بے وقت کی راگنی الاپنے کے مترادف ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادی اور اشتراکی فلسفہ اور یورپ کی زندگی کے خدوخال بروہی صاحب کو متاثر نہ کر سکے۔ بلکہ وہاں کی تہذیب اور فلسفے کے گہرے مطالعے اور تنقیدی جائزے نے ان کے قلب اور ذہن میں خدا

اور رسول کے لیے اور بھی زیادہ جذبۂ عقیدت و احترام اور ذوقِ اطاعت و عبودیت پیدا کر دیا ہے۔

"بروہی صاحب،" مَیں نے خیالات کی سطح پر تیرتے ہوئے پوچھا "آپ کے خیال میں اسلامی تہذیب اور مادی و اشتراکی تہذیبوں کے مابین کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں، اسلامی تہذیب کی بنیاد خدا اور رسُولؐ کی اطاعت پر قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کا منبع اور مخرج قوانینِ الٰہیہ ہیں جنھیں خدا کے رسُولؐ نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں عملاً نافذ کیا۔ اس بنیادی اصول پر کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنیادی اصول پر جو کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے اسے یہ کام اسلام کے دائرے سے باہر نکل کر کرنا چاہیے۔"

بروہی صاحب کا چہرہ وفورِ جذبات سے تمتما اٹھا تھا لیکن ان کا لہجہ بدستور سنجیدہ اور دھیما تھا۔ جذبات پر قابو پانے کی ان میں بے پناہ قوّت اور صلاحیت موجود ہے۔ جذبات کا پیدا ہونا تو ایک فطری امر ہے لیکن ان کی رَو میں نہ بہنا ضبط و تحمّل کی علامت ہے۔

بروہی صاحب نے پہلو بدلا اور عالمِ اضطراب میں کہنے لگے:-

"اسلام پر نظریاتی بحث کرنا اب کچھ زیادہ مفید نہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہماری زندگیاں اسلام کی سچّی شہادت دیں۔ پھل اپنے درخت سے پہچانا جاتا ہے۔ دنیا ہماری بداعمالیوں کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں رائے قائم کرتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ اگر آج ہم اسلام سے علیحدگی کا اعلان کر دیں تو یورپ کا بڑا حصّہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائے۔ جب وہ ان ممالک کی حالت کو دیکھتے ہیں جن پر "اسلامی ممالک" کا لیبل چسپاں ہے تو ان کے قدم اسلام کی طرف بڑھنے سے رک جاتے ہیں۔ اشاعتِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "ہم خود" ہیں۔ اس گھر کو ہم نے خاکستر بنایا ہے اور نامعلوم کب تک ہم اس کی ویرانیوں میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ اسلام کو فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعے سے نہیں پھیلایا جا سکتا۔ عہدِ رسالت میں لوگوں نے اسلام کو اس کی فلسفیانہ تعلیمات کو سمجھ کر قبول نہیں کیا تھا بلکہ رسُولِ اکرم صلعم کا پاکیزہ کردار، جو قرآن مجید کی

جیتی جاگتی تفسیر تھا، اس نے لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایمان وایقان کی مشعلیں روشن کی تھیں"

بروہی صاحب کا لہجہ پُرسوز اور اندوہ گیں بنتا جا رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے:۔

"اسلام اور" اسلامی کلچر" کے لفظوں کا جتنا مذاق ہم نے اڑایا ہے شاید اتنا کسی اور نے نہیں اڑایا۔ بیرسیل سے آئے ہوئے ایک ضعیف العمر شخص کے یہ الفاظ میرے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہیں۔" مجھے پاکستان میں اسلام کی بجائے" اسلامی کلچر" دیکھنے کا موقع ملا اور اسلامی کلچر کیا تھا، اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کی رقص وسرود کی محفلیں"۔۔۔ جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور میرا سر ندامت سے جھکا جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا جس کی ابتدا طاؤس ورباب سے ہوئی ہے اس کی انتہا کیا ہو گی"

بروہی صاحب سے اسلام کے موضوع پر گفتگو کافی طول پکڑ چکی تھی، مگر دل اب بھی یہی چاہتا تھا کہ بس یہی گفتگو ہوتی رہے کہ شاید اپنی بے عملی کی داستان دوسروں کی زبانی سن کر ہم اپنے سینوں میں اضطراب کی لہریں محسوس کرنے لگیں۔ سارا المیہ تو یہی ہے کہ ہمارے بحرِ حیات کی موجوں میں اضطراب نہیں رہا۔ سنتے ہیں کہ ایک طویل خاموشی کے بعد طوفان آیا کرتا ہے۔ شاید ہماری زندگی بھی کسی طوفان سے آشنا ہو جائے لیکن" ہمارے ہاں کے طوفان" سے بھی ڈر لگتا ہے۔ کتنا بھیانک ہے وہ طوفانی گرداب جس میں پاکستانی معاشرہ تنکے کی طرح چکر کاٹ رہا ہے۔

پاکستانی معاشرے کا خیال آتے ہی میں نے بروہی صاحب سے سوال کیا:۔

"آپ کے نزدیک ہمارے معاشرے میں زوال پذیری کی جو کیفیت موجود ہے، اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں"؟

"صرف دو ہی سبب ہیں"، بروہی صاحب نے فیصلہ کن اور پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا،" مادیت کی پرستش اور من کی دیوی کی پوجا پورے ماحول پر ۔۔۔ کچھ مستثنیات کے سوا ۔۔۔ مادیت اور افادیت کی کہر چھائی ہوئی ہے۔ ہر فرد کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا مقصد حصولِ دولت بن کر رہ گیا ہے اور یہ زر پرستی سمندر کے پانی کی مانند ہے جسے جتنا زیادہ پیا جائے، پیاس

اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ وہ سراب ہے کہ جس میں جتنا زیادہ آگے بڑھا جائے منزل اتنی ہی دُور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم شاید فطرت کا یہ اصول بھول گئے ہیں کہ اگر ہم صرف دولت کے لیے تگ و دَو کرتے رہیں گے تو دولت ہمیں کبھی نصیب نہیں ہو گی۔ دولت سے بے نیاز ہو جاؤ، دولت کے ذخیرے تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔ تاریخ کا فیصلہ تو یہی ہے، لیکن شاید ہم نے اپنے لیے کچھ اور فیصلہ کیا ہُوا ہے۔ کائنات کے سینے پر شیروں کی طرح دندنانے والے اور شاہین کی طرح فضائے بسیط کی انتہائی بلندیوں کو چھونے والوں نے آج روٹی کے چند نوالوں ـــ اور وہ بھی "چبائے ہوئے" نوالوں کو منتہائے حیات تصوّر کر لیا ہے۔ اقبالؔ کے اس شعر کو سازِ مطرب پر نہیں، زندگی کے ساز پر پڑھنے کی ضرورت ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسری خرابی جس نے ہمارے معاشرے کو بری طرح متاثر کیا ہے وہ ہماری خود پسندی اور خود پرستی ہے۔ خلوصِ نیت اور اخلاصِ عمل تقریباً تقریباً مفقود ہے۔ ہم اگر کوئی اچھا کام کرتے بھی ہیں تو وہ خدا ترسی یا جذبۂ خدمت سے سرشار ہو کر نہیں کرتے، بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے ہماری نیک نامی اور شہرت میں اضافہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اگرچہ کئی اچھے کام ہو رہے ہیں، لیکن چونکہ ان کے پیچھے نیّت کا خلوص کار فرما نہیں، اس لیے وہ نہ ہمارے معاشرے کے لیے سود مند ثابت ہوئے ہیں اور نہ ہی ان سے ہماری عملی زندگی میں کوئی خوش گوار انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ خود غرضی، خود پسندی، اپنی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنے کی خواہش، اپنی ذات کو دوسروں سے بالاتر کرنے کی آرزو ـــ یہ ہیں وہ جذبات اور احساسات جو مختلف شکلوں اور روپوں میں اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو مثالی انسان وہ ہیں جو زمین پر متانت و عجز کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان کا واسطہ جاہلوں (غیر شائستہ لوگوں) سے پڑتا ہے تو وہ سلامتی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں، اور ہم میں آج سب سے بڑا انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ کرخت، بے حس اور

خود پرست ہے۔ ہم نے ان عیوب کے لیے نہایت شائستہ اور دلفریب الفاظ تراشے ہوئے ہیں اور ہم اس خود فریبی میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو فریب دے رہے ہیں کہ یہ خوبیاں ہیں: بُرائیاں نہیں ہیں۔"

"اس صورت حال کو بہتر کیونکر بنایا جاسکتا ہے؟" میں نے امید کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

"تعلیم و تربیت کے ذریعے سے۔" بروہی صاحب نے جواب دیا" وہ تعلیم و تربیت جس کا آغاز بچے کے گہوارے سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لحد تک چلتا ہے۔ ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی تربیت کے بغیر انسان میں وہ کردار نہیں ابھرتا جو اسے" مادیت" اور" ذاتیات" سے بلند کر دے۔ تربیت کا یہ نظام صرف اسلام قائم کر سکتا ہے، مگر اسے قائم کرنے کے لیے ایسے" صاحبِ نظر" اور" صاحبِ دل" کی ضرورت ہے جو سرتاپا حرارت ہو، جسے چھُو جائے اسے کیمیا بنا دے، جس کی نظر تقدیر بدل دے، جس کی پاکبازی، راست روی، حق گوئی اور حق کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ ــــ دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ ایسے افراد کے بغیر انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگر تمام دنیا میں سے چند مُٹھی بھر ایسے افراد نکل آئیں جن کی زندگیاں صحیح طور پر اسلام کے مطابق ہوں تو ایک عظیم انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

" بروہی صاحب، سوال یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا کیسے کیے جائیں۔ کیا معاشرے کی آغوش سے ایسے افراد ابھر سکتے ہیں؟"

بروہی صاحب نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا:

"مجھے معلوم نہیں ایسے افراد کہاں سے آیا کرتے ہیں اور ان کی تخلیق میں کن کن عوامل کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ ماحول کی پیداوار نہیں ہوتے۔ اگر انہیں ماحول نے جنم دیا ہوتا تو وہ ماحول سے ٹکراتے اور نئی دنیا آباد کرنے کی صلاحیت و قوت سے قطعاً محروم ہوتے ــــ یہ افراد اصلاح و تعمیر اور تجدید و احیاء کے عظیم کام کے لیے ناگزیر ہیں اور ان کے بغیر اصلاحی کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں۔"

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ اصلاحی مساعی کے لیے کسی مجدد کا انتظار کیا جائے؟"

"مَیں یہ تو نہیں کہتا کہ کوشش نہ کی جائے، لیکن میرے نزدیک کامیابی کے لیے صاحبِ نظر کی رہنمائی بہت ضروری ہے اور قدرت ایسے صاحبِ نظر پیدا کرتی رہتی ہے۔ دیکھئے ہمارے چمن میں کب دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔"

بروہی صاحب "دیدہ ور" کی باتیں کر رہے تھے اور مَیں اس سوچ میں غرق تھا کہ مسلمانوں میں پھیلے ہوئے بہت سے غلط تصوّرات نے پہلے ہی انہیں بے عمل بنا رکھا ہے۔ ہمارے حالات اسی لیے تو بد سے بدتر ہوتے چلے گئے کہ ہم اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کہ کوئی آئے گا، اس کے آتے ہی حالات سدھر جائیں گے اور اس کے آئے بغیر حالات سدھر ہی نہیں سکتے۔ اس کارگاہِ عمل میں انتظار کرنے والا ہمیشہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے جو کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔ اصلاحِ ذات کا احساس اگر ہر فرد میں پیدا ہو جائے اور یہ شعور ایک اجتماعی تنظیم اور تحریک کی صورت اختیار کر جائے تو بگڑی ہوئی صورت کو یقیناً بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ خدا کے سامنے ہر فرد نے اپنے ایک ایک سانس کا حساب دینا ہے۔ کیا وہاں ہم یہ کہہ کر سرخرو ہو جائیں گے کہ ہم صاحبِ نظر کا انتظار کرتے رہے اور یہ ساری زندگی اسی انتظار میں کٹ گئی۔ کیا ہم تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک ایسا معاشرہ جنم نہیں دے سکتے جس کے اکثر افراد میں وہ خوبیاں موجود ہوں جو اسلام انسانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ روس میں ایک خاص قسم کا ذہن اور ایک خاص قسم کا کردار لوگوں کے اندر سے ابھارا جا سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اجتماعی جدوجہد کے ذریعے سے ایسے افراد تیار نہیں کر سکتے جو اسلامی صفات کے حامل ہوں۔ آخر اس کے لیے کسی کے انتظار کی کیا ضرورت ہے؟"

تعلیم و تربیت کی طرف ذہن منتقل ہُوا تو مَیں نے بروہی صاحب سے تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بارے میں استفسار کیا کہ وہ کس حد تک ہمارے تعلیمی نظام کو مِلّی اور قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکیں گی۔

بروہی صاحب نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے کہا:۔

"قریشی صاحب، تعلیمی سفارشات سے زیادہ ہمیں ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو صحت مند خطوط پر ہماری نوخیز نسل کی تربیت کر سکیں۔ قرآن حکیم، جو زندگی کا سب سے بڑا مکمل ہدایت نامہ ہے اور جس میں تعلیم و تربیت کے اصول و مبادی موجود ہیں، اس سے ہم نے کب استفادہ کیا، حالانکہ تنزیل قرآن اور بعثتِ رسولؐ کا اولین مقصد ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ہے۔ قرآن و سنت میں سب کچھ موجود ہے۔ اب ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ایسے اساتذہ تیار کیے جائیں جنہیں علم سے جنون کی حد تک شغف ہو، سیرت و کردار کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کے انسان ہوں اور جن سے حرارت اور زندگی کے چشمے پھوٹتے ہوں۔ صرف ایسے ہی اساتذہ کے ذریعے سے تعلیم و تربیت کا صحیح نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔"

بروہی صاحب ایک منٹ کے لیے رُکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلامی تاریخ کے دریچوں میں سے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے خدوخال دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ جیسے متاعِ گم گشتہ مل گئی ہو۔ سرور آگیں کیفیت الفاظ میں ڈھلتی چلی گئی:۔

"کتنے اچھے تھے ہمارے اسلاف! انہوں نے تعلیم و تدریس کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ہمارے اکثر اساتذہ، حکمت و طب کے ذریعے سے روزی کماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی علم سے وابستگی ہر قسم کی مادی منفعت سے بالاتر تھی۔ کاش آج بھی ایسا ہو سکے۔"

"بروہی صاحب"، مَیں نے موضوع کو بدلتے ہوئے سوال کیا "ہم مغربی پاکستان کے لوگوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب کیوں کر لا سکتے ہیں؟"

"قریب لانے سے اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ ان کے فطری اور قدرتی اختلافات ختم کر کے ان میں مصنوعی یکسانیت پیدا کر دی جائے تو مَیں کہوں گا کہ یہ یگانگت اور قربت پاکستان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ تنوّع میں ایک نوع کی دلکشی اور جاذبیت موجود ہے بلکہ حسن نام ہی مختلف چیزوں کو سلیقے سے یکجا کر دینے کا ہے۔ کیا چمن کی ساری نظر افروزی اور شگفتگی اس بات سے قائم نہیں کہ اس میں گوناگوں رنگ

کے پھول کھلتے ہیں اور ہر پھول کی خوشبو جدا ہے۔ موسیقی کی محفل کا تصور کیجئے۔ وہاں ہر ساز کی سُر اور لَے جدا جدا ہے لیکن جب یہ موزونیت کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو قلب اور ذہن پر سرود و نشاط کا ایک سحر آفرین تاثر بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔"

"اس تجزیے کے مطابق مغربی پاکستان کے لوگوں میں فطری وحدت پیدا کرنے کے لیے ہمیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ مختلف اجزاء میں موزونیت اور حسنِ ترتیب پیدا کر دیا جائے۔ یہ کام اگر بتدریج، احتیاط اور تدبّر سے کیا جائے تو کچھ زیادہ مشکل نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم آسان کام کو بھی اپنی بے تدبیریوں سے مشکل اور کٹھن بنا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، خاموشی سے دھیرے دھیرے، مثبت نقطۂ نظر کے ساتھ کام کرتے چلے جائیں۔ آپ جتنا کسی پر علاقہ پرستی، تنگ نظری اور لسانی تعصّب کے لیبل چسپاں کریں گے اتنی ہی صورتِ حال اور زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتی چلی جائے گی اور پھر یہ تو سوچو کہ اگر کوئی ہمارا بھائی اس قسم کے مرض میں مبتلا بھی ہے، تو کیا یہ ہمارے لیے مناسب ہے کہ ہم اسے مریض کہتے چلے جائیں اور اسے اپنی برادری سے کاٹ کر پھینک دیں؟ ایک مشفق اور دردمند بھائی کا تو یہ رویّہ نہیں ہو سکتا۔"

میرا خیال تھا کہ چونکہ قانون کی زبان خشک اور جذباتی آمیزش سے بالکل پاک ہوتی ہے اس لیے بروہی صاحب کے لہجے اور زبان میں قانون کی سی خشکی اور غیر جذباتیت ہو گی لیکن جب انہوں نے تشبیہات اور استعارات کے شبنمی قطرے چھڑکنے شروع کیے تو مجھے یوں لگا جیسے خارستانِ خیال گلاب کی طرح شاداب ہو گیا۔ قانون اور ادب کا امتزاج کتنا حسین ہوتا ہے۔

ابھی مَیں اس حسین امتزاج کی دلکشی سے لطف اندوز ہو ہی رہا تھا کہ قریب رکھے ہوئے اخبار کی سرخی پر نظر پڑی۔ "ہندوستان میں مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم"۔ معاً خیال آیا کہ بروہی صاحب ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں، ان سے اس سلسلے میں گفتگو کرنا موزوں رہے گا۔ اس خیال کے آتے ہی مَیں

بروہی صاحب سے مخاطب ہُوا:۔

"آپ کے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ کیسے ممکن ہے؟"

بروہی صاحب دردِ غم کی تصویر بن گئے وہ دھیمی آواز میں کہنے لگے:۔

"مَیں چودہ مہینوں کے لگ بھگ ہندوستان میں رہا ہوں۔ مَیں نے وہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ آج بھی جب مَیں ان بے بس اور نہتّے مسلمانوں کا تصوّر کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ ان مسلمانوں نے پاکستان کے لیے بیشمار قربانیاں دیں اور یہ جانتے ہوئے دیں کہ پاکستان کے قیام سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ آج وہ ہندوؤں کے نرغے میں ہیں۔ ان کی عزّت، آبرو، جان و مال اور مفادات شدید خطرے میں ہیں اور سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ان کا مستقبل حال سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ یہ سنگین مسئلہ فوری توجہ کا مستحق ہے۔ اس میدان میں یوں تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن میری رائے میں سب سے زیادہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ دوستی کی روش اختیار کریں۔ ہماری طرف سے دیئے ہوئے گرم گرم بیانات، سرحد کے اس پار مسلمانوں کے سرخ خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہم کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں تحمل، احتیاط اور تدبر و فراست سے کام لیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے جیسے ان پر شدید کرب کی کیفیت طاری ہو۔ انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا:۔

"ہم اہلِ افغانستان کے دلوں کو بھی جیت سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم ملّی اور انسانی نقطۂ نظر سے معاملات کو دیکھنا شروع کر دیں۔ اگر ہم اعلیٰ تر اور وسیع تر مقاصد کے لیے کام کرتے چلے جائیں تو ہم یقیناً کامیابی اور سرفرازی کی مسرتوں سے اپنا دامن بھر سکیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ راستہ کٹھن مرحلوں میں سے ہو کر گزرتا ہے اور اس پر چلنے والوں کو کچھ قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں لیکن عظیم تر مقصد کے لیے آج کی دی ہوئی قربانیاں، کچھ عرصے کے بعد نہایت ہی خوش گوار نتائج پیدا کریں گی۔ سمجھ دار قومیں آنے والے پچاس ساٹھ سالوں کے لیے

پروگرام آج ہی بنا لیا کرتی ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری نگاہ "آج" اور "کل" کی حدود سے پرے نہیں دیکھ سکتی۔"

بروہی صاحب کے خیالات فکر انگیز بھی تھے اور خلوص سے بھرپور بھی۔ ان کے نتائجِ فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انہیں بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مَیں نے بروہی صاحب سے ملک کے عدالتی نظام کی اصلاح کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا:

"موجودہ عدالتی نظام کا ہماری سوسائٹی کی معاشرتی تنظیم سے گہرا تعلق ہے۔ سوسائٹی کے موجودہ ڈھانچے کو تبدیل کیے بغیر عدالتی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی لانا سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہمارا اخلاقی معیار جس قدر پست ہے، جھوٹی شہادت دینے اور واقعات کو چھپانے یا غلط رنگ میں پیش کرنے میں ہم جتنے طاق ہو چکے ہیں، اس کے پیشِ نظر موجودہ عدالتی نظام نہایت موزوں اور متوازن ہے۔"

مَیں نے اس سلسلے میں ایک اور سوال کیا:۔

"کیا وکالت کے پیشے میں رہتے ہوئے ایمان داری، دیانت داری اور حق گوئی کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں" انہوں نے دو ٹوک جواب دیا۔ "مجھے اس پیشے سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور آج بھی ہے لیکن اس کے باوجود مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ایک وکیل حق گو اور دیانت دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس راستے پر چلنے والے چند ہی لوگ ہوتے ہیں۔"

دس بجنے والے تھے۔ بروہی صاحب کے کچھ احباب ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اب بروہی صاحب سے مزید سوالات کرنا زیادتی ہو گی۔ لیکن ابھی ان کی زندگی کے بارے میں پوچھنا باقی تھا۔ مَیں نے الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے سوال کیا:

"اپنی زندگی کے کچھ اہم اور دلچسپ واقعات تو سنائیے۔"

بروہی صاحب مسکرا دیئے۔ "اہم اور دلچسپ "واقعات"۔۔ ان سے زندگی کلیتہً خالی ہے۔ بتانے والی کوئی خاص بات نہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

مَیں نے کہا: "میری مراد یہ ہے کہ آپ اپنے خاندان، اپنی تعلیم، تعلیم کے دوران میں اساتذہ کے اثرات، عملی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلّق کچھ بتائیے۔"

"اچھا" انہوں نے یہ کہہ کر زندگی کے اوراق پلٹنے شروع کر دیے۔ "مَیں ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء کو ضلع سکھر میں پیدا ہوا۔ میرے والد صاحب پی ڈبلیو ڈی کے محکمے میں ملازم تھے۔ مجھے بچپن ہی سے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا۔ میرا وقت زیادہ تر سفید ریش بزرگوں کے ساتھ گزرتا۔ مَیں ان سے دینی امور کے متعلق پوچھتا رہتا۔ ان بزرگوں نے دینی جذبہ میرے رگ و ریشے میں پیوست کر دیا۔ یہ شعور اتنا پختہ تھا کہ آگے چل کر مَیں دیارِ مغرب میں بھی رہا اور مجھے بہت اونچی سوسائٹی میں گھومنے پھرنے کے بے شمار مواقع میسّر آئے، لیکن اس جذبے اور اس شعور میں ذرا بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مَیں بچپن ہی سے اپنے اندر خدا کی پیاس شدّت سے محسوس کرتا تھا۔ یہ پیاس بڑھتی ہی چلی گئی۔

بی۔ اے۔ آنرز کے بعد مَیں نے ۱۹۳۹ء میں ایم۔ اے فلسفہ اور قانون کے امتحانات پاس کیے۔ مجھے استاد بننے کا بے حد شوق تھا لیکن قدرت کی حکمتیں ہی کچھ اور ہیں۔ مجھے وکالت کا پیشہ اختیار کرنا پڑا، حالانکہ مجھے اس سے سخت نفرت تھی۔

مجھے سیاست سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا لیکن یہاں بھی یہی ہُوا کہ اس سے جتنا دامن بچانا چاہا اتنا ہی اُلجھ کر رہ گیا۔ ۱۹۵۲ء کی ایک صبح کو جب مَیں اٹھا تو مجھے غلام محمد مرحوم نے بُلا کر کہا کہ تمہیں وزیر بنا دیا گیا ہے۔ ۱۹۵۴ء تک وزیرِ قانون کی حیثیت سے کام کرتا رہا، لیکن جب مَیں نے محسوس کیا کہ سیاسی شعبدہ بازیوں، قانونی بے ضابطگیوں اور علاقائی سازشوں نے کابینہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے

تو مَیں نے ۱۹۵۴ء میں استعفیٰ دے دیا۔ ع

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اس کے بعد ایک بار مجھے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کا بھی شرف حاصل ہُوا ہے۔ ان دنوں الجیریا کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ مَیں نے اس مسئلے پر پاکستانی عوام کے جذبات کو صحیح انداز میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی۔ میری تقریر نے عرب ممالک کو بہت زیادہ متاثر کیا اور وہ پاکستان کے قریب تر آ گئے۔

۱۹۶۰ء کے آغاز سے لے کر ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء تک مَیں ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور اس کے بعد سے وہی ہم ہیں اور وہی ہمارا کوچہ۔ وکالت کے پیشے میں روپیہ پیسہ خوب کمایا جا سکتا ہے، لیکن یہ میرے پیشِ نظر نہیں۔ صرف اتنا کام کرتا ہوں جس سے زندگی باعزّت طور پر بسر ہو جائے۔"

دس بج چکے تھے۔ ہم نے اجازت لی اور کھڑے ہو گئے۔ بروہی صاحب نے میری پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مَیں نے یوں محسوس کیا کہ شفقت کی برقی رَو میرے سارے بدن میں دوڑ گئی ہے۔ کون کہتا ہے کہ محبت میں حرارت نہیں۔ اسی حرارت ہی سے تو گلشنِ حیات کی تازگی اور شگفتگی قائم ہے۔

کھڑے ہو کر ہم پھر محوِ گفتگو ہو گئے۔ بروہی صاحب کی شفقت اور بے تکلّفی کے پیشِ نظر مَیں نے چلتے چلتے ان سے پوچھا:

"بروہی صاحب، آپ مشرقی پاکستان کئی بار گئے ہوں گے، آپ نے وہاں کے لوگوں کو کیسا پایا؟"

"وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔" بروہی صاحب نے پُر امید لہجے میں کہا، "وہ دین کے شیدائی، محبِّ وطن اور سیاسی طور پر بہت زیادہ باشعور ہیں۔ ان کے دلوں میں ہمارے لیے محبّت و احترام کے جذبات موجزن ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ فیاضی اور فراخدلی کا سلوک روا رکھیں۔ آخر وہ ہمارے

بھائی ہیں۔ قریشی صاحب، آپ وہاں ضرور جایئے اور محبت کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھیے۔"

مَیں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا:

"بروہی صاحب، اس سرزمین کو دیکھنے کی خواہش مدت سے میرے سینے میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ دیکھیے کب جانا نصیب ہوتا ہے۔"

مسکراہٹوں کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

میاں بشیر احمدؒ

ماہ و سال کی گردش نے ایک نئی کروٹ لے کر ابھی ابھی ۱۹۶۲ء کو جنم دیا تھا۔ جنوری کی تئیس تاریخ تھی۔ دھوپ کی شعاعوں کے ساتھ ہوا کے سرد جھونکے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ موسم حد درجہ کیف آگین تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بدمست وقت کے بہتے دریا میں خمار آگیں انکھڑیوں کے نشے گھول رہا ہے۔ دل کے بربط پر جوان آرزوئیں میٹھے میٹھے نغموں کی تانیں اڑا رہی تھیں۔ ایسے میں دل پھر وہی فرصت کے رات دن ڈھونڈنے لگا جب تصورِ جاناں کی رعنائیوں اور جلوہ آرائیوں نے زندگی کو جنت نظیر اور فردوس گوش بنایا ہوا تھا۔

دن کے دو بج چکے تھے۔ میں ابھی تک خیالات کی دنیا میں مستغرق تھا۔ معاً خیال آیا کہ مجھے تو اڑھائی بجے ایک تحریک میں حصہ لینے کے لیے مال روڈ پر پہنچنا ہے۔ ادھر موسم کے اشارے کچھ اور کہہ رہے تھے اور ادھر تحریک کی اہمیت اور افادیت کے تقاضے کچھ اور تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے ذہن کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا اور بالآخر ادائے فرض کا جذبہ غالب آیا۔ میں پورے اڑھائی بجے ہائی کورٹ کے بالمقابل پھیلے ہوئے

خوبصورت پلاٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ یہی میری منزل تھی۔ اس مقام سے ایک ایسے نئے تجربے کا آغاز ہونے والا تھا جس سے تو میں پہلے قطعاً آشنا نہیں تھی۔

یہاں کوئی تیس چالیس کے لگ بھگ افراد جمع تھے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہیں "دانشور" کہا جاتا ہے۔ کچھ خواتین بھی تھیں۔ یہ اصحابِ فکر و دانش اس لیے جمع ہوئے تھے کہ وہ ٹولیاں بنا کر یال روڈ پر پھیل جائیں۔ دکان داروں اور کاروباری اداروں سے درخواست کریں کہ وہ اپنی دکانوں اور فرموں کے سائن بورڈ انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی لکھوائیں۔ ان اصحاب میں ایک مختصر قدوقامت کے بزرگ، جوانوں کی سی پھرتی کے ساتھ گروپوں کو تشکیل دینے میں مصروف تھے۔ معلوم نہیں ان کی شخصیت میں کیا کشش تھی کہ میری نگاہیں ان پر مرکوز ہو کر رہ گئیں اور ان کی حرکات و سکنات کا تعاقب کرنے لگیں۔ اپنے ایک دوست سے میں نے آہستہ سے پوچھا:

"وہ کون صاحب ہیں؟"

"ارے، تم نہیں جانتے!" میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں بھائی! مجھ میں یہی تو سب سے بڑا نقص ہے کہ میں اکثر لوگوں کو نہیں جانتا اور جو آج تک اپنے آپ کو بھی نہ جان سکا، اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی جان سکتا ہے۔" میں نے اپنی عدم واقفیت پر فلسفے کا دبیز پردہ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ میاں بشیر احمد ہیں جو "ہمایوں" نکالا کرتے تھے اور ترکی میں پاکستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔"

اتنے میں گروپ بندی ہو چکی تھی۔ مجھ پر بھی ایک گروپ کی قیادت لاد دی گئی۔ ہم نے تقریباً تین گھنٹے کام کیا۔ کام کے خاتمے پر ہم میاں بشیر احمد صاحب کی قیام گاہ پر جمع ہوئے۔ مجھے اس وقت میاں صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں ان کی سادگی، صاف گوئی اور بے غرضی سے بہت زیادہ متاثر ہو کر اٹھا۔ تمام راستے سوچتا رہا کہ ایسے شخص کو روشناس کرانے کی اشد ضرورت ہے جس کی خاموشیوں میں کئی انقلاب انگڑائیاں

لے رہے ہیں۔

مَیں نے فون پر میاں صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو کی۔ انھوں نے وقت دے دیا۔ مَیں اور ظفراللہ خاں صاحب وقتِ معیّن پر ان کی اقامت گاہ پر پہنچ گئے۔ یہ عمارت، جو باغِ جناح کے پہلو میں واقع ہے، ایک طرف حسن و رنگ کی گوناگوں بہاروں کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے اور دوسری طرف صحافت اور سیاست کے بے شمار رازہائے سربستہ اور علم و ادب کے اَن گنت ہنگاموں کی امانت دار ہے۔

میاں صاحب نے ہمیں اپنی لائبریری میں بٹھایا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی بیش قیمت کتابیں قاری کے حُسنِ ذوق اور علمی مذاق کا پتہ دے رہی تھیں۔ میاں صاحب پست قد کے دُبلے پتلے سے آدمی ہیں۔ ان کے چہرے کے خد و خال، ان کی شرافت، متانت اور خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ عینک کے شیشوں میں سے جھانکتی ہوئی گہری نیلگوں آنکھوں نے شاندار ماضی کی اَن گنت داستانیں اپنے اندر سمیٹ رکھی ہیں۔ سر کے بال دُور دُور اڑے ہوئے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق جس کے سر کے بال اُڑے ہوئے ہوں وہ بڑا آدمی ہوتا ہے۔

میاں صاحب کا لہجہ متین مگر شگفتہ ہے۔ جب اردو زبان میں بات کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عوامی لیڈر پریس کانفرنس سے مخاطب ہے کبھی لہجہ دھیما ہے اور کبھی پُر جوش، اپنی ایک ایک بات کی وضاحت بار بار کر رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی رپورٹر اس کی بات کو غلط معنی پہنا دے، مگر جب وہ انگریزی زبان استعمال کرتے ہیں تو لہجے میں تحکم اور وقار آجاتا ہے۔

میاں صاحب ایک اچھے قانون دان، ایک بلند پایہ صحافی، ایک شگفتہ شاعر، ایک منجھے ہوئے سیاسی کارکن، ایک کامیاب سفیر اور ایک خوش قسمت خاوند ہیں۔ خوش قسمت خاوند اس لیے کہ انہیں ایک ایسی رفیقۂ حیات میسّر آئی ہے جو مشرقی خاتون ہونے پر فخر کرتی ہے اور جسے مہمان نوازی میں ایک نوع کی مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے اس محترم خاتون کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولیں گے جو اس نے اپنے گھر پر دی ہوئی

ایک دعوت میں کہے تھے :

"مَیں مغرب کی میم نہیں ہوں کہ مہمانوں کی آمد پر ناک بھوں چڑھاؤں۔ میری ساری زندگی مہمان نوازی میں گزری۔ میرے نزدیک انتہائی خوشی کا تصوّر یہ ہے کہ میرے گھر مہمان آتے رہیں اور مَیں انہیں کھلاتی پلاتی رہوں۔"

یہ الفاظ تکلّف اور تصنّع کے ہر شائبے سے بلند تھے۔

میاں صاحب کی عظمت کا سب سے جدا اور منفرد پہلو یہ ہے کہ ان سے باتیں کرتے ہوئے متکلم کو اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ مخاطب سے کچھ اس انداز میں باتیں کرتے ہیں کہ اس میں یہ اعتماد ابھرتا ہے کہ وہ میاں صاحب سے زیادہ جانتا ہے، حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں بہت کم باتیں کرتے ہیں لیکن دوسرے کی شخصیت کے بارے میں اس درجہ دلچسپی لینے لگتے ہیں کہ جیسے وہ کسی عظیم شخصیت کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ صاف گوئی کا یہ عالم ہے کہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے میں قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کرتے، یہی تو حقیقی عظمت ہے۔

مَیں میاں صاحب سے سوالات کرنے کے لیے پَر تول ہی رہا تھا کہ انہوں نے قدرے بے ساختگی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا :

"اس سے پہلے کہ آپ میرا انٹرویو لیں، مَیں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

مَیں گھبرایا کہ میاں صاحب نامعلوم کیا پوچھ بیٹھیں، آج اپنی علمیت کا تمام پول کھل جائے گا۔ میاں صاحب غالباً میری گھبراہٹ کو بھانپ گئے۔ نہایت ہی شیریں لہجے میں بولے :

"مَیں آپ سے آپ کے رسالے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

مَیں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا :

"بڑے شوق سے۔"

وہ جو کچھ پوچھتے گئے مَیں بتاتا گیا۔ جب مَیں نے بتایا کہ اس جریدے کی اشاعت[1] آٹھ ہزار ہے، تو ان کے چہرے پر مسرّت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات پھیل گئے۔

"آٹھ ہزار! مَیں آپ لوگوں کو اس شاندار اور حیرت انگیز کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے اس راہ کے تمام نشیب و فراز معلوم ہیں، اس راہ میں کتنے ہی چراغ جلے، جب تک کچھ سرپھرے اپنا خونِ جگر دیتے رہے، یہ چراغ ٹمٹماتے رہے، جب قوم نے اِن چراغوں میں تیل ڈالنے کی طرف توجہ نہ دی تو انہوں نے سسک سسک کر دم توڑ دیا۔ فی الواقع آپ لوگوں نے اردو صحافت کو ایک نئے تجربے سے روشناس کرایا ہے، لیکن بھائی، مَیں اس رسالے میں کچھ خامیاں محسوس کرتا ہوں، اس میں اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور قومی روایات کے متعلّق بہت ہی کم مواد ہے۔ حصّۂ نظم بھی کچھ تشنہ سا ہوتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ آپ اس جریدے کو قوم کے ذہن و فکر اور سیرت و کردار کی تطہیر و تعمیر کے لیے استعمال کریں۔"

مَیں نے جب رسالے کی پالیسی بالوضاحت ان کے سامنے پیش کی، تو وہ کافی مطمئن نظر آنے لگے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

"اب آپ مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہیں، پوچھ سکتے ہیں۔"

"اپنی زندگی کے کچھ دلچسپ حالات اور اہم کوائف بتائیے۔" یہ میرا پہلا سوال تھا۔

"قریشی صاحب، آپ کس کی زندگی کے بارے میں سوال کر رہے ہیں — میری زندگی کے بارے میں؟ میری زندگی اتنی سپاٹ اور سادہ ہے کہ اس میں کوئی بتانے والی بات نظر ہی نہیں آتی۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میرے والد ایک عظیم انسان تھے، لیکن اس پر ندامت ہے کہ مَیں وہ کچھ نہ بن سکا جو ایک عظیم باپ کے بیٹے کو بننا چاہیے تھا۔"

یہ کہہ کر وہ رک گئے۔ مَیں نے ان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ان کی آنکھیں گلشنِ زیست میں آرزوؤں کے ان غنچوں کو تلاش کر رہی تھیں جو بن کھلے مرجھا گئے تھے۔ دفعتہً آنکھیں چمک اٹھیں اور

---

[1] یہ اشاعت جنوری ۱۹۶۲ء کی ہے۔

میاں صاحب نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا:

"مَیں مارچ ۱۸۹۳ء میں بمقام باغبان پورہ (لاہور) پیدا ہُوا۔ میرے والد صاحب کا نام میاں محمد شاہ دین تھا، جو برِّصغیر پاک و ہند میں جسٹس شاہ دین ہمایوں کے نام سے متعارف ہیں۔ میرے کردار کی تشکیل میں میرے والد مرحوم کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ وہ ایک پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ اصول پسندی، راست گوئی اور حق کے لیے ایثار کیشی اُن کے کردار کے نمایاں خدوخال تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کبھی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ میرے ذہن میں وہ واقعات بھی محفوظ ہیں جن میں انہوں نے انگریزی حکام کے مقابلے میں حق کا ساتھ دیا اور ضمیر کی آواز پر ملازمت تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس زمانے میں احتجاج کے طور پر ملازمت چھوڑ دینا ایک بہت بڑی بات تصوّر کی جاتی تھی۔ ان کا یہ کردار میرے سامنے تھا جس نے شعوری اور غیر شعوری طور پر میرے ذہن و فکر کو بے حد متاثر کیا۔ گو مَیں لاشعور میں والد صاحب کے نقشِ قدم پر چلنے کے خاکے تیار کیا کرتا تھا، لیکن افسوس کہ عملاً مَیں اس امتحان میں پُورا نہ اترا۔

والد صاحب نے گھر میں جو علمی، ادبی پاکیزہ ماحول پیدا کیا ہُوا تھا، اس نے بھی میرے مزاج اور عادات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مَیں نے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا حلقہ اپنے ارد گرد پایا۔ یہ لوگ اکثر ہمارے گھر پر جمع رہتے اور اپنی خیال افروزیوں سے نئے نئے چمنستان کھلاتے رہتے، جن کی عطر بیز ہوائیں میرے اِدراک سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی گزر جاتیں۔ میری زندگی میں سب سے زیادہ گہرا اثر اسلامی تاریخ کی کتابوں نے ڈالا۔ علامہ شبلیؔ کی "الفاروق" نے میرے ذہن کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مَیں نے حالیؔ، سرسیّد، شبلیؔ، مولوی نذیر احمد کی اکثر کتابوں کا مطالعہ اس عمر میں کیا جب الھڑ بچے کسی بامقصد شعور سے بہت کم آگاہ ہوتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ اے کرنے کے بعد مَیں آکسفورڈ چلا گیا۔ وہاں سے بیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ہندوستان میں واپس آکر دو تین سال وکالت کی، لیکن مجھے اس پیشے سے قطعاً

کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مَیں نے والد صاحب سے کہا کہ مَیں تعلیم کے شعبے میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میرے اس جذبے کو سراہا اور مَیں ان کے توسّط سے اسلامیہ کالج لاہور میں آنریری لیکچرار ہو گیا۔ میرے مضمون اسلامی تاریخ اور علم السیاست تھے۔ تین سال تک اس کالج میں کام کیا۔ اس عرصے میں والد صاحب انتقال فرما گئے۔ مَیں نے ۱۹۲۲ء میں کچھ ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اور کچھ اپنی ادب پسندی اور خود پسندی سے لطف اٹھانے کے لیے رسالہ "ہمایوں" نکالا جو ۱۹۵۷ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔

۱۹۴۹ء میں حکومتِ پاکستان نے مجھے ترکی میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا۔ دو سال کے قریب اس ملک میں رہا، پھر اپنے وطن واپس آ گیا۔ اس وقت سے ایک ایسے شخص کی زندگی بسر کر رہا ہوں جسے سیاست کی زبان میں "خاموش شہری" کہتے ہیں۔"

میاں صاحب کے حالاتِ زندگی نے مجھے ایک گہری سوچ میں ڈال دیا۔ ہماری پچھلی نسلیں اس بناء پر مضبوط سیرت و کردار کی مالک تھیں کہ ان کے سامنے ان کے بزرگ کردار کا نہایت ہی اچھا نمونہ پیش کرتے تھے اور بچّے غیر شعوری طور پر اپنی زندگیوں میں وہی صفات پیدا کرتے چلے جاتے تھے۔ آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اکثر والدین بچّوں کے تشکیلِ کردار کی نفسیات کو سمجھتے ہی نہیں۔ وہ اپنے بچّوں کے سامنے ایسا کردار پیش کرتے ہیں جسے معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ حق گوئی، حق نیوشی، اصول پسندی اور اعلیٰ مقاصد کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی تڑپ اب کہاں باقی ہے۔ ان حالات میں بچّوں اور جوانوں کی بے راہروی کا صرف ماتم کر لینا کہاں تک صحیح ہے؟

میاں صاحب جب پہلے سوال کا جواب ختم کر چکے، تو مَیں نے حالاتِ زندگی کو کریدتے ہوئے پُوچھا:

"آپ نے قانون پڑھا، لیکن آپ کی زندگی کا بڑا حصّہ ادب و صحافت کے گرد گھومتا رہا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

میاں صاحب نے برجستہ جواب دیا:

"اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارا قومی مزاج ہے۔ اس زمانے میں جب میں اپنا کیریر بنا رہا تھا، اس وقت قوم کے مزاج میں شعر و ادب اس طرح رچا بسا ہُوا تھا کہ ایک حساس نوجوان کے لیے شاید اس کے سوا اور کوئی میدان ہی نہ تھا کہ وہ ادبی دنیا میں داخل ہو کر آگے بڑھنے کی سعی کرے۔ والد صاحب کی ادب نوازی اور ان کے پیدا کیے ہوئے علمی ماحول نے بھی میرے میلان کو علم و ادب کی طرف پھیرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔"

اس سلسلے میں، مَیں نے ایک اور سوال کیا:

"ہمایوں نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے، اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، لیکن میاں صاحب، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ "ہمایوں" نے اردو ادب میں ایک انفرادی مقام کیوں کر حاصل کیا اور آپ کے پیشِ نظر ہمیشہ کون سے مقاصد رہے؟"

میاں صاحب ایک لمحے کے توقّف کے بعد فرمانے لگے:

"ہمایوں کا مقام متعیّن کرنا تو نقادوں کا کام ہے، البتّہ مَیں اس پرچے کے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ مسلسل ۲۵ سال تک ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں پوری باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ میرے علم کے مطابق اردو صحافت میں یہ اپنے طرز کی پہلی مثال ہے۔ دوسری چیز جو ہمیشہ میرے پیشِ نظر رہی، وہ علمی متانت اور ادبی پاکیزگی تھی۔" ہمایوں نے قارئین کو ہمیشہ ایسا مواد فراہم کیا جس سے جہاں ایک طرف فکر و نظر کی آبیاری ہوتی تھی، وہاں اخلاق و کردار پر بھی خوش گوار اثر پڑتا تھا۔ تیسری بات جس کا مَیں نے خاص خیال رکھا وہ یہ تھی کہ مضمون کے معیار کا فیصلہ مضمون نگار کے نام کے بجائے نفسِ مضمون سے کیا جائے۔ یعنی صرف یہ دیکھا جائے کہ مضمون فی نفسہٖ معیاری ہے یا غیر معیاری، اس سے قطع نظر کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ اس اصول کا یہ فائدہ ہُوا کہ اس رسالے میں ان لوگوں کے مضامین کو جگہ ملتی رہی جو اس وقت زیادہ شہرت نہیں رکھتے تھے، لیکن ان کی تحریر میں زندگی اور سوچ بچار میں سنجیدگی اور اچھوتا پن موجود تھا۔ اس

سے نوجوان طبقے میں اردو لکھنے کا رجحان تقویت پکڑتا گیا۔"

"ہمایوں" کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے خیال سے میں نے ایک اور بات دریافت کی:

"میاں صاحب، مختلف اوقات میں ہمایوں کے کون کون سے ایڈیٹر رہے؟"

"۳۵ سال کی طویل مدت میں اس کا ایڈیٹر تو میں ہی رہا تاہم مختلف وقتوں میں اس کے مختلف جائنٹ ایڈیٹر رہے۔ ان میں تاجور نجیب آبادی، حامد علی خاں، منصور احمد، یوسف ظفر، شیر محمد اختر اور ناصر کاظمی قابلِ ذکر ہیں۔"

ادب و صحافت پر کافی باتیں ہو چکی تھیں، میں نے نئے موضوع کو گفتگو کا مرکز بنانے کی کوشش کی:

"آپ کا سیاست سے کبھی کوئی تعلق رہا ہے؟"

"جی ہاں، میں مسلم لیگ سے وابستہ رہا ہوں۔ دراصل مجھے سیاست کے ہنگاموں سے ڈر سا لگتا تھا اور میں سیاست سے دُور رہنا ہی پسند کرتا تھا لیکن زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ مجھے اس کوچے میں قدم رکھنا ہی پڑا۔"

میں نے انتہائی اشتیاق کے عالم میں پوچھا:

"وہ موڑ کونسا تھا؟"

"یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ مسٹر جناح شملہ میں اقامت پذیر تھے۔ مجھے بھی شملہ جانے کا اتفاق ہُوا۔ مسٹر جناح مجھے غائبانہ طور پر پہلے ہی سے جانتے تھے۔ ان سے میرا تعارف پہلے ہی اپنے خسر میاں محمد شفیع کے ہاں ہو چکا تھا اور وہ میرے والدِ محترم جسٹس شاہ دین کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ میری ان سے سرِ راہے ملاقات ہو گئی۔ فرمانے لگے: "میاں بشیر، مجھے کسی وقت ضرور ملئے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" میں ان سے ملا۔ انہوں نے مجھے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ میں نے

معذرت کی کہ مَیں سیاست کے جھمیلوں سے علیحدہ رہ کر اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر جناح نے فرمایا: "اردو زبان کا مسئلہ اب صرف لسانی مسئلہ نہیں رہا۔ یہ ایک سیاسی مسئلے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب اردو زبان کی بقا کا تمام تر انحصار مسلمانوں کی سیاسی وحدت اور قوّت پر ہے۔" انہوں نے مجھے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، جو لکھنؤ میں ہونے والا تھا، شرکت کی دعوت دی تاکہ وہاں اردو زبان کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا جا سکے۔ مَیں اور مولوی عبدالحق صاحب اس اجلاس میں خاص طور سے اسی مقصد کے لیے شریک ہوئے اور مسلم لیگ کے اس اجلاس میں اردو زبان کے متعلق قرارداد منظور ہوئی، جس کے بعد سے اردو زبان کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنا اب مسلم لیگ کے پروگرام میں شامل ہو گیا تھا۔

اس اجلاس کے ولولہ انگیز مناظر نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ مَیں نے ۱۹۳۸ء میں اپنے خالہ زاد بھائی میاں افتخار الدین کی کانگرس کے بالمقابل باغبان پورہ میں مسلم لیگ کی تنظیم قائم کی۔ ۱۹۴۰ء میں جب لاہور کے مقام پر مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا، تو مَیں نے اس وقت مجلسِ استقبالیہ کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ نواب شاہ نواز خاں ممدوٹ مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ جن حالات میں یہ اجلاس ہوا اور جس عزم اور اعتماد کے ساتھ قائدِ اعظم نے تاریخ کے اس نازک موڑ پر قوم کی قیادت کی، یہ تمام باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ مجھے آج بھی جرأت و حرارت بخشتی ہیں۔"

یہ کہتے کہتے میاں صاحب نے اپنی نگاہیں فرش پر گاڑ دیں اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ مَیں نے بھی اپنے آپ کو ان کی سوچ میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کے تصوّر کی نگاہیں منٹو پارک میں ایک ایسی یادگار کو تلاش کر رہی ہیں جن میں ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس کے زیر و بم کو محفوظ کر لیا گیا ہو اور جس کے وجود سے پوری قوم کو زندگی کی حرارت اور امید کی کرن ملتی رہے۔

میاں صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظم کے حکم پر میں نے سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک ڈیڑھ سال تک اس تنظیم کے لیے کام کرتا رہا۔ قائدِ اعظم نے مجھے ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد فرمایا۔ میں ۱۹۴۷ء تک مجلسِ عاملہ کا رکن رہا۔ اس عرصے میں قائدِ اعظم کی شخصیت، مسلم لیگ کے مزاج اور قومی سیاست کے آتار چڑھاؤ کو قریب سے دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔"

دل میں شوق کی لہر اٹھی کہ میاں صاحب سے قائدِ اعظم کے متعلق کچھ پوچھوں۔ انہوں نے تو محبوب قائد کو بارہا دیکھا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی ذہن کے افق پر ایک شعر ابھر آیا ؎

تنہائی کے نازک لمحوں میں کچھ تم ہی ستارو بات کرو
تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا پوچھوں اور کیا نہ پوچھوں۔ ابھرتے ہوئے سوالات کے اژدہام نے حیران بنا کر رکھ دیا تھا۔ آخرکار ایک فیصلہ کن انداز میں میاں صاحب سے مخاطب ہوا:

"آپ بتا سکتے ہیں کہ قائدِ اعظم پاکستان کو کس قسم کی ریاست بنانا چاہتے تھے؟"

میاں صاحب قدرے توقف کے بعد فرمانے لگے:

"جہاں تک میں قائدِ اعظم کو سمجھ سکا ہوں، انہیں جمہوریت اور قرآن سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس نتیجے پر میں مختلف واقعات کے تجزیے کی بناء پر پہنچا ہوں۔ یہ کہ انہیں جمہوریت بے حد عزیز تھی، اس کا اندازہ مجھے مجلسِ عاملہ کے اجلاس کی کاروائیوں سے ہوا۔ وہ ہر رکن کو کامل آزادی کے ساتھ اظہارِ رائے کا موقع دیتے تھے۔ بالخصوص نوجوان طبقے کی اس سلسلے میں بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ وہ گھنٹوں تحمل کے ساتھ اراکین کی آراء کو سنتے رہتے اور کبھی مداخلت نہ کرتے۔ ظاہر بات ہے یہ وہی شخص کر سکتا تھا جس کا جمہوریت پر پختہ یقین تھا۔

قرآن حکیم کے متعلق ان کی کیا رائے تھی، اس کا اندازہ تو اس ایک واقعے سے ہو سکتا ہے، مجھے اس واقعے کا صحیح سن یاد نہیں لیکن واقعہ بالکل یاد ہے۔ قائدِ اعظم ان دنوں دہلی میں مقیم تھے۔ ایک روز میں ان سے ملنے گیا تو میں نے سوال کیا کہ ہم پاکستان کو کن خطوط پر چلائیں گے اور ہمیں اس سلسلے میں رہنمائی کہاں سے حاصل کرنا ہو گی ؟ اس وقت قائدِ اعظم کے سامنے تپائی پر قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔ آپ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے لیے یہ کتاب سب سے اچھی رہنما ہے۔ ہم اسی سے رہنمائی حاصل کریں گے۔"

دل تو یہ چاہتا تھا کہ اسی موضوع پر دیر تک باتیں جاری رہیں لیکن میاں صاحب سے ابھی بہت کچھ اور حاصل کرنا تھا اور ادھر وقت اتنی تیزی سے گزر رہا تھا کہ جیسے محبوب کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے تعاقب میں دیوانہ وار دوڑ رہا ہو۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے میاں صاحب سے دریافت کیا:

"جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ ترکی میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں، آپ نے ترکی میں پاکستان کے متعلق عام طور پر کیسے جذبات پائے اور آپ نے اس ملک میں پاکستان کو متعارف کرانے کے لیے کیا کچھ کیا ؟"

یہ سوال سُن کر میاں صاحب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ وفورِ جذبات سے ان کے الفاظ میں ایک نئی قسم کی روانی اور شگفتگی پیدا ہو گئی۔

"میں نے ترکوں میں پاکستان کے لیے دوستی اور محبت کے پُرخلوص اور گہرے جذبات پائے۔ اسلام کے رشتے نے انہیں یگانگت اور اخوت کی وحدت میں پرو دیا ہے۔ وہ اپنے سینوں میں اہلِ پاکستان کے لیے دھڑکتے ہوئے دل رکھتے ہیں۔ دیہات میں یہ جوش خروش اور بھی زیادہ ہے، وہ شاید اس لیے کہ وہ ابھی تک اسلام کو اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔

ترکی میں دینی اور لادینی قوتوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ وہاں ایک مختصر لیکن بااثر طبقہ ایسا موجود ہے جو قوم میں سے دین کے اثرات کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں اسلام

بے حد عزیز ہے۔ ترکی کے متعدد انقلابات اسی کشمکش کی پیداوار ہیں اور وہاں انقلابات ابھرتے رہیں گے جب تک اسلام اس سرزمین میں ایک کارفرما نظام کی حیثیت سے قائم نہیں ہو جاتا۔

مجھے اس ملک میں پاکستان کو متعارف کرانے کے لیے کچھ زیادہ کام نہیں کرنا پڑا کیونکہ اسلامی وحدت کی بنا پر وہ ہمارے ساتھ پہلے ہی سے بہت زیادہ ہمدردی رکھتے تھے۔ تاہم میں نے بھی اس میدان میں کچھ کام کیا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ برِصغیر پاک و ہند کے مسلمان، ترکوں کے لیے مدتِ مدید سے قربانیاں دیتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے ترکی کے مسائل میں ہمیشہ دلچسپی لی ہے۔ میں نے اپنی بات کے ثبوت میں "ہمایوں کا ترکی نمبر" پیش کیا۔ یہ نمبر ۱۹۲۲ء میں نکلا تھا جب مصطفےٰ کمال کو دشمنوں کے خلاف شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس "ترکی نمبر" نے وہاں کے بعض ذہین لوگوں پر نہایت ہی خوش گوار اثر ڈالا۔

اس کے علاوہ میں نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ برصغیر پاک و ہند کے اکثر مسلم حکمران ترکی النسل تھے، جن کے ذریعے سے دونوں علاقوں میں تہذیبی، لسانی اور ثقافتی میل ملاپ کے دائرے وسیع ہوتے چلے گئے۔ اس بات کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہماری اردو زبان کا نام ایک ترکی لفظ ہے۔

سب سے زیادہ مؤثر طریقہ جو میں نے اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ میں وہاں کے لوگوں سے ایک عام انسان کی حیثیت سے ملتا تھا، ان سے باتیں کرتا تھا۔ میں نے ترکی زبان بھی سیکھی۔ سوائے چند الفاظ اور دو تین شعروں کے اب میں بالکل بھول چکا ہوں۔ اس میل جول کے نتائج اچھے بلکہ امید سے بڑھ کر اچھے نکلے۔"

سفارتی سرگرمیوں کے بارے میں ایک اور سوال میرے ذہن میں ابھرا۔

"میاں صاحب! آپ کی رائے میں سفارت کی ذمہ داریوں سے بہ حُسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے کن بنیادی امور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے؟"

میاں صاحب دو چار منٹ کے لیے خاموش رہے۔ پھر نہایت محتاط انداز میں سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمانے لگے:

"قریشی صاحب، یہ ایک نہایت ہی اہم اور نازک موضوع ہے جو سنجیدہ اور گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ مَیں اس سلسلے میں تین چار امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

سفیر کی کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار اس بات پر ہے کہ وہ جس ملک کی نمائندگی کر رہا ہے، وہ قوت و عظمت کا مالک ہو۔ ایسا ملک جو داخلی انتشار کا شکار ہو اور اس کی بین الاقوامی ساکھ کا دیوالیہ نکلا ہوا ہو، اس ملک کا سفیر لاکھ کوشش کرے، اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ سفیر کو اپنے ملک کو روشناس کراتے وقت مبالغہ آمیز اور گمراہ کُن باتیں نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اپنے ملک کی صحیح اور سچّی تصویر پیش کرنی چاہیے۔ اگر اچھے اور بُرے دونوں پہلو سامنے رکھ دیے جائیں تو وہاں کے لوگ سفیر کی انصاف پسندی اور حق گوئی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ جس دَور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں جھوٹا پراپیگنڈا اپنے پاؤں جما ہی نہیں سکتا۔ اگر کچھ دیر کے لیے آپ لوگوں کو فریب میں مبتلا کر بھی لیں تو حقیقتِ حال کے کھل جانے پر نہایت ہی بُرا ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے۔

مَیں اس معاملے میں یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اگر سفیر یہ سمجھتا ہے کہ کسی مسئلے پر اس کی حکومت کی پالیسی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ اس پالیسی کی حمایت نہ کرے۔ بین الاقوامی سیاست میں اخلاق ایک نہایت ہی مُؤثر قوت ہے۔ سفیر کی پوزیشن اخلاقی اعتبار سے جتنی زیادہ مضبوط ہو گی، وہ اتنی ہی پُراثر بات کہہ سکے گا۔

سفیر کی کامیابی کا راز اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ جس ملک میں مقرر کیا گیا ہے، وہاں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے، ان میں دلچسپی لے اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرے۔ مجھے کامل یقین ہے

کہ ایسا کرنے سے وہ وہاں کے لوگوں کے دلوں کو موہ لے گا، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ لوگ بھی اس کے مسائل میں گہری دلچسپی لینے لگیں گے۔ اس مقصد کے لیے سفیر کو اس ملک کی زبان ضرور سیکھ لینی چاہیے۔ جب وہ ان کی زبان میں ان سے باتیں کرے گا تو وہ اسے اپنا سمجھنے لگیں گے۔ زبان کی وحدت، محبت اور یگانگت کے روابط اور تعلقات کو پختہ کرنے میں ایک نہایت ہی مؤثر قوّت ہے۔"

سفارت کی باتیں ختم ہوئیں تو پاکستانی معاشرہ ہماری گفتگو کا مرکز بنا۔ میاں صاحب کی رائے ہے:

"پاکستانی معاشرہ بہت تیزی سے زوال و انحطاط کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اخلاقی بنیادیں منہدم ہوتی جا رہی ہیں اور خیال و فکر کا انتشار سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ مادی ترقی شاید ہم نے کچھ کی ہو لیکن روحانیت کی پاکیزگی اور عظمت بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"لیکن میاں صاحب! ان خرابیوں کو دُور کیسے کیا جائے؟"

"میرے نزدیک اس کا واحد حل یہ ہے کہ ہر فرد اپنی اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ ایمان، جسے میں کیریکٹر کہتا ہوں، اسے زیادہ سے زیادہ پختہ اور محکم بنایا جائے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھا جائے اور زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کی مسلسل کوشش کی جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میری زندگی اس نمونے کے مطابق ہے۔ مجھے اپنی خامیوں کا پُورا پُورا احساس ہے۔"

"مگر میاں صاحب، ہماری بنیادی خرابی تو ہے ہی یہی کہ ہماری انفرادی زندگی فرض کے احساس سے تہی ہے۔ ضرورت تو اسی خرابی کو دُور کرنے کی ہے۔ اسے کیسے دُور کیا جائے؟ یعنی ہر فرد میں اس احساس کو کیسے ابھارا جائے کہ اسے اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے بجا لانے ہیں۔ یہ احساس خود بخود تو اُبھرتا نظر نہیں آتا۔ اگر یہ اپنے طور پر ابھر سکتا تو آج معاشرے کی یہ حالت نہ ہوتی،" میں نے میاں صاحب کے تفصیلی خیالات معلوم کرنے کے لیے بات کو آگے بڑھایا۔

میاں صاحب کے لہجے میں قدرے تیزی آگئی تھی، وہ جذبات کی روانی میں کہہ رہے تھے:

"میرے نزدیک ایسے افراد اور ایسی قوم کی بیماریوں کا کوئی علاج نہیں جو شعور و احساس کی دولت سے دُور رہنا چاہتی ہو اور جو بُرے بھلے میں تمیز کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ ایسے افراد کو نتائج بھگتنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ مَیں ویسے بھی لمبے چوڑے پروگرام بنانے اور بلند بانگ نعرے لگانے کا قائل نہیں ہوں۔ ہماری قوم میں جتنی سیاسی اور دینی تحریکیں اٹھتی رہی ہیں، ان میں سے بیشتر ایسی تھیں جنہوں نے شروع میں قوم کے سامنے بہت اونچے مقاصد اور لمبے چوڑے پروگرام رکھے، لیکن بعد میں انہیں عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ اس کا ردِعمل یہ ہُوا کہ قوم مایوسی اور بے عملی کا شکار ہو گئی۔ میرے نزدیک کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ چھوٹے پیمانے پر آغاز کیا جائے اور پھر جوں جوں وسائل میسّر آتے چلے جائیں، کام کی وسعت اور پھیلاؤ میں اضافہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے قوم کا مزاج جذباتی بن گیا ہے۔ میری اس سے یہ مراد نہیں کہ جذبات سرے سے ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ جذبات کے بغیر زندگی میں گہما گہمی اور ہلچل پیدا نہیں ہوتی، لیکن ہم جذبات کے بارے میں افراط و تفریط کے شکار ہیں۔ شروع شروع میں ہمارا جوش ایک تند و تیز طوفان کی مانند ہوتا ہے، لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے، جوش میں کمی آتی چلی جاتی ہے اور پھر انتشار کا ایک صحرا اُبھر آتا ہے ___ ایک ایسا صحرا جہاں سے کبھی پانی کی ایک موج بھی نہ گزری ہو۔ میرے خیال میں اب یہاں ایسی تحریک چلانے کی اشد ضرورت ہے جس میں اس تحریک کے قائدین، عام کارکنوں کے ساتھ کام کریں اور کارکنوں کے جوش و خروش کو آخری وقت تک قائم رکھیں۔"

مَیں پورے انہماک سے میاں صاحب کی باتیں سُن رہا تھا۔ انہوں نے ہمارے قومی مزاج اور معاشرتی تنزّل کا کتنا صحیح تجزیہ کیا تھا، لیکن کچھ الفاظ میرے ذہن پر استفہامیہ نشان کی صورت میں منقش ہو گئے۔

"اعتراف کے بعد؟ ___ اصل کام تو اعتراف کے بعد ہی سے شروع ہوتا ہے، لیکن یہ اصل کام کون کرے گا؟ یہ سوال ابھی تک تشنۂ جواب ہی رہا۔ یہ کام تو دراصل دانشوروں کے کرنے کا ہے جو

اپنے تدبر، بیباکی، جرأت مندی اور حق گوئی کی بدولت قوم کو بے عملی اور مایوسی کے بھنور سے نکال کر ساحلِ مراد تک لایا کرتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں کے دانشوروں پر تو خود جمود کی کہر چھائی ہوئی ہے۔ اب کس سے توقع رکھی جائے۔ تاہم دانشوروں کو یہ ضرور محسوس کر لینا چاہیے کہ ان کی اس وقت کی غفلت شعاری اور کم ہمتی کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

دل بیم و رجا کے متلاطم جذبات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ اضطراب کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ذہنی فضا میں تموّج پیدا کر رہی تھیں۔ اتنے میں وہ نیا تجربہ ذہن کے پردے پر پھیل گیا جس کا آغاز لاہور کے دانشوروں نے اردو سائنس بورڈ کی شکل میں کیا تھا۔ میں فوراً میاں صاحب سے مخاطب ہُوا:

"میاں صاحب، پاکستان میں اردو کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے اور ہم اس سلسلے میں کیا کچھ کر سکتے ہیں؟"

میاں صاحب نے ایک پُرسوز لیکن پُراعتماد لہجے میں کہا:

"مجھے یہ سوال ہی چبھتا ہے کہ پاکستان میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا۔ اردو کا مستقبل پاکستان کے مستقبل سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جس وقت پاکستان کے لیے ہم جنگِ آزادی لڑ رہے تھے، اس وقت ہمارے زعماء اور قائدین کے اذہان اردو کے بارے میں بالکل صاف تھے۔ ہم صرف سیاسی غلامی کے خلاف جہاد نہیں کر رہے تھے، بلکہ ہمارے پیشِ نظر ان تمام لسانی، تہذیبی، ثقافتی زنجیروں کو بھی کاٹ دینا تھا جو ہندو اکثریت بڑی عیاری کے ساتھ ہمیں پہنائے جا رہی تھی۔ بہر حال اب بھی صورتِ حال یہی ہے کہ کم از کم مغربی پاکستان کے لیے مذہب کے بعد سب سے بڑی قوت جو اس خطّے کو متحد رکھ سکتی ہے، وہ اردو زبان ہے۔ جب ہم مغربی پاکستان کے لیے اردو زبان کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ پنجابی، پشتو اور سندھی کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس ہم ان سب کی ترقی کے بھی خواہاں ہیں۔ میرے نزدیک اردو زبان کے مقابلے میں ان کی حیثیت "بولیوں" کی سی ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ بولیاں بھی ترقی اور نشو و نما کی منازل طے کر سکتی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور ترقی وار تقاء کے لیے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں، تو اس کے جواب میں مَیں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ حکومت اور عوام کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ جلد از جلد اردو زبان کو وہ مقام عطا کرے، جس کا یہ ایک قومی زبان ہونے کی حیثیت سے تقاضا کرتی ہے۔ عوام اسے اپنی روزمرّہ کی زندگی میں استعمال کر کے یہ ثابت کریں کہ انہیں فی الواقع اس زبان سے گہرا قلبی لگاؤ ہے اور وہ اسے قومی زبان کی حیثیت دینے کے لیے حد درجہ مضطرب ہیں۔"

وقت زیادہ ہو چکا تھا۔ میاں صاحب بھی کچھ تھک سے گئے تھے۔ محبت و عقیدت کے سلام اور پیام کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ چلتے چلتے مَیں نے میاں صاحب پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مسکراہٹ اور ہلکی سی یاسیت کا امتزاج ایک نہایت ہی حسین منظر پیش کر رہا تھا۔

مولوی تمیز الدین خاں

آٹھ سال کے شدید انتظار کے بعد قوم نے ۔۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پہلی بار یہ مژدہ سُنا کہ پاکستان کا دستور تشکیل و تکمیل کی تمام منزلیں طے کر چکا ہے اور اسے ۲۵ دسمبر کو نافذ کر دیا جائے گا۔ ابھی محمد علی بوگرہ (اس وقت کے وزیرِ اعظم) کے یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ ۲۴ اکتوبر کو غلام محمد مرحوم (سابق گورنر جنرل) کا یہ اعلان بم کے دھماکے کے ساتھ پھٹا کہ "پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔" قوم کے اس عنصر نے جس کا مطمحِ نظر ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ہے، اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور گورنر جنرل کے اس اقدام کو ملک و ملّت کی بقا اور سلامتی کے لیے ناگزیر اور بے حد مفید قرار دیا۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے سے ان "حواریوں" کے بیانات اس انداز میں پھیلائے اور نشر کیے گئے کہ یوں گمان گزرتا تھا کہ پوری قوم جمہوریت کی گردن زدنی پر شاداں ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ، جو جمہوریت کا خون بہتا ہُوا دیکھ کر کرب و اضطراب کے انگاروں پر لوٹ رہے تھے، حسرت و یاس کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ شاید ان کے شوق کی بلندی ہمتوں کی پستی میں دم توڑ کر رہ گئی تھی۔ سیاست

کے افق پر بے یقینی، شکوک و شبہات اور سرگوشیوں کی اتنی تہیں جم گئی تھیں کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ قوت و آمریت کے منحوس سائے فضا کو اور بھی ہولناک اور تاریک بنا رہے تھے۔

اتنے میں مولوی تمیز الدین خاں صاحب (دستور اسمبلی کے سپیکر) ایک دیوانے کی جرأت کے ساتھ آگے بڑھے۔ انہوں نے گورنر جنرل کے اقدام کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سندھ چیف کورٹ نے اس مقدمے کی سماعت کی اور گورنر جنرل کے اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیا۔ اس مقدمے میں آئین و قانون نے غیر آئینی آمریت پر فتح پائی تھی ـــ یہ جمہوریت کی فتح تھی۔ میں اس فتح پر بے حد خوش تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وفورِ مسرت سے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

آگے چل کر اس مقدمے نے کچھ اور ہی شکل اختیار کر لی ـــ مولوی تمیز الدین خاں صاحب کا آئینی موقف مبہم آئینی اصطلاحوں اور سیاسی مصلحتوں کی نذر ہو گیا ـــ فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے مطابق ایک نئی دستور ساز اسمبلی تشکیل پذیر ہوئی اور پاکستان دستور سازی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہُوا۔

بظاہر تمیز الدین خاں صاحب مقدمہ ہار گئے تھے، لیکن ان کے جرأت مندانہ اقدام نے اس وقت ملک کو آمریت کے شکنجے سے آزاد کرانے میں نہایت ہی اہم اور ناقابلِ فراموش تاریخی کردار ادا کیا۔ اگر وہ ایک بزدل انسان کی طرح اقتدار کے سامنے جھک جاتے، یا آمریت کے شبخون مارنے پر خاموش رہتے تو ملک کی آئینی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔

مولوی صاحب نے قانون اور آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے جس عزم، جرأت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے آگے غیر آئینی قوتوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

گردشِ لیل و نہار نے پاکستان کی سرزمین میں کئی روپ اختیار کیے، یہاں تک کہ جون ۱۹۶۲ء کی ایک جانفزا صبح طلوع ہوئی۔ مولوی تمیز الدین خاں کی لاہور میں آمد آمد کا غلغلہ بلند ہُوا۔ ان کی آمد نے "سیاسی برف خانے" میں آگ سی لگا دی۔ وہ لاہور کے ایمبیسڈر ہوٹل میں آکر ٹھہرے تھے۔ میں نے ٹیلی فون کا ڈائل گھمایا۔ دوسری طرف

سے اردو میں ایک لڑکھڑاتی ہوئی آواز بلند ہوئی:

"مَیں تمیز الدین خاں ہوں۔"

مَیں نے اپنا مقصد بیان کیا کہ مَیں "اردو ڈائجسٹ" کے لیے آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔"

آواز آئی:-

"مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن اب تو مَیں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ آپ وہاں تشریف لے آئیے۔ اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

مَیں نے ان سے تاریخ مقرر کر دینے کی درخواست کی۔

"آپ ۲۷ جون کو آجائیے۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے۔"

۲۷ جون کی شام کو امین اللہ وثیر، عبدالجبار صاحب اور راقم الحروف راولپنڈی کے لالہ زار سے گزرتے ہوئے مولوی صاحب کی اقامت گاہ پر پہنچے۔ عمارت پر ایک پرانا سا پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ دل کو دھچکا سا لگا۔ عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ اس کی سطح بتدریج بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ دُور سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کی چٹانوں کو تراش کر عمارت کی شکل دے دی گئی ہے۔ سرخ و سپید رنگوں کی آمیزش کے ساتھ دُور دُور تک پھیلا ہُوا سبزہ اور شفق کی حنائی عکس ریزی زندگی کے سادہ خاکوں میں رنگ بھر دیتی ہے۔ نکہتِ بادِ بہاری جب یہاں کے فرشِ زمردیں پر پھسل کر سنبھلتی ہے تو غنچے بے ساختہ مسکرا دیتے ہیں اور فضا عطر بیز ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے ہماری ملاقات مولوی تمیز الدین خاں صاحب کے سیکرٹری ــ شمس الدین صاحب سے ہوئی۔ وہ سانولے رنگ کے بلند قامت ذہین نوجوان ہیں۔ پانچ دس منٹ کے بعد مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ ململ کا کرتہ زیب تن کیے، اوسط قد و قامت، سیاہی مائل گندمی رنگ، لاغر جسم جو کبھی مضبوط و توانا ہوگا لیکن حوادث کی پیہم یلغار اور مخالف قوتوں سے مسلسل کشمکش کی وجہ سے اب وہ تھک سا گیا ہے۔ قدرے کشادہ پیشانی جس پر مولوی صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھی ہے۔ آنکھیں ــ شرافت و نجابت کی آئینہ دار اور اگر

ان میں جھانکا جائے تو آپ کو زندگی کے بے شمار نشیب و فراز تیرتے نظر آئیں گے۔ مسکراتے ہوئے باتیں کرتے ہیں اور بات بات پر مسکرا دیتے ہیں۔ لہجے میں دھیمے پن کے ساتھ ساتھ بلا کا وقار اور تحکم موجود ہے۔

اُردو زبان میں خیر مقدم کرتے ہوئے مولوی صاحب نے ہمیں اپنے قریب بٹھایا۔

مَیں نے بیٹھتے ہی سوال کیا:۔

"آپ نے یہ اردو زبان کہاں سے سیکھی؟"

"اتنی اردو تو مشرقی پاکستان میں رہنے والا تقریباً ہر فرد ہی جانتا ہے۔" انہوں نے سنجیدگی میں مسکراہٹ گھولتے ہوئے جواب دیا۔

مَیں نے سوچا کاش مغربی پاکستان میں رہنے والے بھی بنگلہ زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم ایک دوسرے کی زبان سمجھنے اور بولنے لگ جائیں تو محبت اور یگانگت کے رشتے اور بھی مضبوط ہو جائیں۔

میرے ایک ساتھی نے خاں صاحب سے قدرے بے تکلفی کے عالم میں سوال کیا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں "مولوی" کا لفظ عام مستعمل ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

تمیز الدین خاں صاحب نے سادگی سے جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہمارے ہاں "مولوی" کا لفظ احترام کے طور پر بولا جاتا ہے۔ دراصل یہ "مسٹر" کے ہم معنی ہے۔ یہ لفظ عام طور پر دیندار طبقے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

جی میں آیا کہ خاں صاحب کو بتا دوں کہ ہمارے ہاں بعض حلقوں میں "مولوی" کا لفظ نفرت و حقارت کا نشان بن کر رہ گیا ہے۔ جب کسی فرد کی تحقیر مقصود ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے:

"وہ تو نِرا مولوی ہے۔"

تمہیدی باتوں کے بعد مَیں نے مولوی صاحب سے ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق استفسار کیا۔

خاں صاحب نے فخر و اعتماد کے ساتھ کہنا شروع کیا:۔

"میں نے ۱۸۹۰ء میں ایک نہایت ہی غریب خاندان میں آنکھ کھولی لیکن میرے آباؤ اجداد کو مبداءِ فیاض کی طرف سے خودداری اور حمیت کی وافر دولت عطا ہوئی تھی۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، مقصد براری کے لیے آداب بجالانا اور قوت و اختیار کے آستانے پر جبہ سائی کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ میں نے ان کی سادگی، وضعداری اور اصول پسندی سے گہرا اثر قبول کیا اور یہی اثر زندگی کے پُرپیچ راہوں میں میرا سہارا بنا رہا۔

ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ مختلف تعلیمی اداروں سے گزر کر میں نے ۱۹۱۳ء میں ایم اے۔ انگریزی اور ۱۹۱۴ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ پورے برِصغیر میں، میں پہلا مسلمان تھا جس نے ایم۔ اے۔ انگریزی کیا تھا۔"

"خاں صاحب،" میں نے سوال کیا۔ "آپ نے وکالت کا امتحان طبعی رجحان کے تحت دیا تھا یا کسی مقصد کے حصول کے لیے؟"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہے اور پھر پُرجوش لہجے میں بولے :۔

"وکالت کے میدان میں، میں ایک منصوبے کے تحت داخل ہؤا تھا۔ دراصل ہم چند احباب نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ "سرکار" کی ملازمت نہیں کریں گے۔ "سرکار" کے خلاف ہمارے دلوں میں جذبۂ نفرت نہایت شدید تھا۔ یہ جذبہ چند وجوہ کی بناء پر طالب علمی کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں وکالت صرف ایک ایسا پیشہ تھا جس میں سرکار کے آگے سر جھکائے اور جذبۂ حریت کو کچلے بغیر روزی کمائی جا سکتی تھی۔"

میں نے رُکتے رُکتے مزید پوچھا :۔

"خانصاحب، آپ میں عمر کے کس حصے میں سیاسی شعور بیدار ہو گیا تھا اور کن واقعات و اسباب نے اسے جنم دیا تھا؟"

خان صاحب نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چشمِ تصور سے ایامِ رفتہ کے غبار آلود واقعات کا کھوج لگا رہے تھے۔ بھولے بسرے واقعات کے نقوش نے اُبھر اُبھر کر ایک اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی،

وہ پہلو بدلتے ہوئے کہنے لگے :

"یہ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ ہمارے قصبے میں نجم الدین نامی ایک مسلم مبلغ آیا۔ اس نے اپنی تقریر میں اسلام کے تقاضوں، اس کی روح اور اس کی آفاقی حیثیت کو واضح کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہوئیں۔ اسلام کے انقلابی تصور نے مجھے چونکا سا دیا۔ اس سے پہلے میں اسلام کو چند رسوم کی ادائیگی تک محدود سمجھتا تھا۔ میں نے اپنے سینے میں اضطراب کی ایک کسک محسوس کی، لیکن ابھی عملی قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ اس تقریر کے ایک سال بعد میری زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے زندگی کے دھارے کا رخ یکسر پھیر دیا۔"

"وہ موڑ کونسا تھا؟" میں نے عالم شوق میں پوچھا۔

"وہ موڑ" انہوں نے کہا "نہایت ہی عجیب موڑ تھا۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ انہی دنوں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی تھی، ایک ہندو لیڈر — ایمبکیر چرن ہمارے سکول میں آیا اور اس نے تقسیم بنگال کے خلاف ایک شعلہ بار اور سحر انگیز تقریر کی۔ اس تقریر کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں تعلیم کو خیر باد کہہ کر اس تحریک میں کود پڑا۔ اس وقت بنگال کی سرزمین کوہ آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔ انگریزی استعماریت کے خلاف ہم نے تخریبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ تحریک اپنے جلو میں اتنے طوفانی ہنگامے لیے ہوئے تھی اور یہ ہنگامے فضا میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ کچھ اور سنائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بالآخر انگریزی حکومت نے ۱۹۱۱ء میں اس تحریک کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی۔ اگرچہ اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس تحریک میں مجھے حصہ نہیں لینا چاہیئے تھا لیکن اس تحریک نے مجھے جو سیاسی شعور اور عمل کی قوت عطا کی اس نے ساری عمر مجھے نچلا نہیں بیٹھنے دیا اور سیاسی سرگرمیاں میری زندگی کی روحانی غذا بن گئیں۔

"کیا آپ نے اس کے علاوہ کسی اور سیاسی تحریک میں بھی حصہ لیا؟" میں نے اس موضوع میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" خاں صاحب نے عالمِ جوش میں جواب دیا" مَیں نے تقریباً ہر اس تحریک میں حصّہ لیا جو اس برِصغیر پاک و ہند میں جنم لیتی رہی — تحریکِ خلافت، تحریکِ عدمِ تعاون، کانگریس، مسلم لیگ، مجھے اپنے سیاسی مسلک کے لیے جیلوں میں بھی جانا پڑا، میرے اس جسم نے انگریزی استبدادیت کے لرزہ خیز مظالم بھی برداشت کیے۔ میری معاش کی نیا کئی بار سیاسی گرداب کی نظر ہوئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر الحمد للّٰہ میرے قدم میں کبھی لغزش نہیں آئی"۔

خانصاحب اتنا کہہ کر رُک گئے۔ ان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ وہ غالباً شدّتِ جذبات پر قابو پانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ کمرے میں کامل سکوت تھا۔ ایسا سکوت جو کسی خاص ذہنی کیفیت کی غمازی کر رہا ہو۔ مَیں نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا:۔

"خانصاحب، جیل کا کوئی اہم واقعہ سنائیے"۔

"واقعات تو بے شمار ہیں لیکن مَیں آپ کو صرف ایک واقعہ سنانے پر اکتفا کرتا ہوں"۔

"انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت کے باعث ہم حکومت کے کسی افسر کو سلام نہیں کرتے تھے۔ یہ بات حکّام کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دن ہم سب سیاسی قیدیوں کو جمع کر کے یہ تنبیہہ کی گئی کہ کل ڈپٹی کمشنر صاحب نے جیل کے معائنے کے لیے آنا ہے۔ اگر کسی قیدی نے انہیں سلام کرنے سے انکار کیا تو اسے عبرتناک سزا دی جائے گی۔ اگلے روز ہمیں ایک احاطے میں بلا لیا گیا۔ وہاں ڈپٹی کمشنر آیا اور ہمیں سلام کرنے کا حکم دیا گیا۔ چند کمزور طبیعت قیدیوں کے سوا اکثر نے سلام کرنے سے انکار کر دیا۔ ایڈیشنل مجسٹریٹ اس کام پر مامور کیا گیا کہ جن قیدیوں نے سلام نہیں کیا ہے انہیں سزا کے لیے علیحدہ کر لیا جائے۔ جب مجسٹریٹ میرے پاس آیا تو ایک لمحے کے لیے رکا، مجھے دیکھا اور پھر گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے اُس کے اس رویّے پر احتجاج کیا اور کہا: جب مَیں نے "سرکار" کو سلام نہیں کیا ہے تو مجھے اس گروہ میں کیوں شامل نہیں کیا جاتا جسے سزا ملنی ہے۔ چنانچہ مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ ہمارے لیے کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی"۔

"کوڑوں کی سزا دینے کا منظر نہایت ہی روح فرسا اور شرمناک تھا۔ قیدی کو ننگا کر دیا جاتا اور پھر نہایت ہی وحشیانہ انداز میں اس کے بدن پر کوڑے برسائے جاتے۔ انسانیت کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک دل ہلا دینے والا تھا لیکن ہر کوڑا ہمتوں کو توڑنے کے بجائے ہمارے عزم کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوا۔ صرف دو قیدیوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی کیونکہ جیل کے قانون کے مطابق ایک ہفتے میں دو سے زیادہ قیدیوں کو یہ سزا نہیں دی جا سکتی تھی۔ تاہم مختلف قیدیوں کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ میرے حصے میں یہ سزا آئی کہ میرے دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر دور وز تک سیدھا کھڑا رکھا گیا۔ میں انہیں ذرا بھی جنبش نہیں دے سکتا تھا۔"

مَیں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ فی الحقیقت سلاسل و زنداں کے بغیر مضبوط سیاسی کردار کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزرے بغیر مسندِ اقتدار حاصل کر لیتے ہیں انہیں حرص و ہوا یا بادِ مخالف کا ذرا سا جھونکا بھی اُڑا لے جا سکتا ہے۔ جس نے اپنے مسلک کے لیے کچھ بھی قربانی نہیں دی اس کی اپنے مسلک سے وابستگی اور شیفتگی کیوں کر ثقہ اور قابلِ اعتماد قرار پا سکتی ہے جنہوں نے پاکیزہ مقاصد کی خاطر جیلوں کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں نفس پرستی اور خود غرضی کے احساسات کو دفن کر دیا ہو اور برسرِ عام دُرّے کھا کر نام و نمود کے جذبے کو موت کی نیند سلا دیا ہو، ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جب بھی ان پاکیزہ مقاصد پر آنچ آئے گی وہ سربکف میدانِ عمل میں نکل آئیں گے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایسی قیادت سے محروم ہیں۔

تحریکِ خلافت کے متعلق مَیں نے خانصاحب سے سوال کیا:

"یہ کہاں تک صحیح ہے کہ یہ ایک سراسر جذباتی تحریک تھی اور اسے کانگرس نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا؟"

خانصاحب نے چچے تلے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا:

"اس تحریک کے بارے میں میرے تاثرات کچھ اور ہی ہیں اور آپ کو ان سے اختلاف کرنے کا پورا

پُورا حق ہے۔ میری رائے میں یہ تحریک اگرچہ ایک جذباتی تحریک تھی لیکن اس کے پیچھے ایک فلسفہ، ایک نظامِ فکر اور ایک مذہبی عقیدہ کار فرما تھا مسلمان خلافت کے ذریعے اپنی مرکزیت کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور علماء اس مرکزیت کو قائم رکھنا ایک دینی فریضہ تصوّر کرتے تھے۔ اس اعتبار سے اس تحریک کو ایک جذباتی تحریک نہیں کہا جاسکتا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس تحریک کی قیادت تھی وہ اپنے اخلاص، ایثار اور خلوصِ نیّت میں بے مثل تھے۔ بلاشبہ یہ تحریک ناکام رہی لیکن اس کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ یہ تحریک فکری بنیادیں نہیں رکھتی تھی۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا۔ ہم سب نماز کے لیے اٹھے۔ لان میں صفیں بچھا دی گئیں سپاہی اور اردلی ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ ہمارے ساتھی عبدالجبار صاحب نے امامت کے فرائض سرانجام دیے ــــ کتنا روح پرور اور وجد آفریں تھا وہ منظر ــــ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری فضا کلامِ ربانی کی خوش الحانیوں اور ترنّم ریزیوں سے بے خود سی ہو گئی ہے۔ کاش! اُونچے اُونچے محلّات اور ایوانوں میں عبودیت اور حمد و تقدیس کی یہ کیفیتیں ہر روز ابھرتی رہیں عظیم الشان بنگلوں میں آنکھیں ان مناظر کے لیے مدّت سے ترس گئی ہیں۔

نماز سے فارغ ہوئے تو خانصاحب نے فرمایا کہ پندرہ بیس منٹ اور دے سکتا ہوں۔ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے واقعی زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پندرہ بیس منٹ میں تمام اہم مسائل کو کیسے سمیٹوں۔ اپنے ذہن میں اہم سوالات کو مرتب کیا اور خانصاحب سے مخاطب ہوا:

"آپ کے خیال میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو زیادہ قریب کیونکر لایا جاسکتا ہے؟"

ایک لمحے کے توقّف کے بعد وہ بولے:

"صرف اسلام کا رشتہ ہی ان دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے سے پیوست رکھ سکتا ہے۔ اسلام کو کار فرما قوت بنائیے، دین کے تعلق کو مستحکم کیجئے۔ ان دونوں حصّوں کو متحد رکھنے کا صرف یہی

راستہ ہے۔"

"کیا یہ کام ہو رہا ہے ؟" میرے ایک ساتھی نے سوال کیا۔

مولوی صاحب نے قدرے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

"جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں وہی مَیں دیکھ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ رُکے پھر ایک نئے عزم کے ساتھ کہنے لگے :-

"اس میدان میں بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ حکومت اور عوام کو زیادہ تیزی، تندہی اور ذمہ داری سے اس کام کو سر انجام دینا چاہیے۔"

گھڑی پر نظر رکھتے ہوئے مَیں نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"کیا رومن رسم الخط پاکستان کے لیے مفید رہے گا؟"

"ہرگز نہیں، رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بعد ہمیں صدیوں کے جمع شدہ دینی، ثقافتی اور احساساتی سرمائے کو دریا برد کر دینا پڑے گا۔" خاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

خاں صاحب جونہی رُکے مَیں نے ایک اور سوال کر دیا :

"کیا بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر کی کثرت ہے ؟"

"بنگلہ زبان کا دامن اسلامی لٹریچر سے خالی نہیں۔ البتہ اس میں وہ فراوانی نہیں جو اُردو زبان میں ہے۔ اہلِ علم حضرات اس میدان میں کام کر رہے ہیں لیکن اس میدان میں مزید توجّہ کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے کلام کو بنگلہ میں منتقل کر کے اسے وسیع پیمانے پر پھیلانا ضروری ہے۔"

مَیں نے وقت کی سی تیز رفتاری کے ساتھ سوال کیا :-

"پاکستان میں جو ثقافت فروغ پا رہی ہے کیا اسے اسلامی ثقافت کہا جا سکتا ہے ؟"

انہوں نے قدرے سوچ بچار کے بعد جواب دیا :

"پاکستان میں ثقافتی اعتبار سے دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو مغربی تہذیب اور تمدن سے گہری وابستگی رکھتا ہے اور وہ اسی تہذیب کو پاکستان میں فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اسلام کے ساتھ شدید جذباتی لگاؤ رکھتا ہے لیکن اس میں اتنی سکت نہیں کہ پہلے طبقے کی تہذیب اور اس کی ثقافت کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ یہ رقص و سرور کی محفلیں، یہ تنگ اور چست نیم عریاں لباس، یہ صنفی ہیجان پیدا کرنے والے آرٹ کے مُرقّعے، اسلامی ثقافت کے مظہر تو نہیں ہیں لیکن یہ بتدریج معاشرے میں راہ پا رہے ہیں۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت خان صاحب کی باتیں سُننے کے لیے ٹھہر گیا تھا۔

"پاکستانی معاشرہ، اکثر کہا جاتا ہے، رُو بہ تنزل ہے۔ آپ کے اس کے متعلق کیا تاثرات ہیں؟" مَیں نے خانصاحب پر نظریں جماتے ہوئے پُوچھا۔

مولوی صاحب نے انگریزی لہجے میں بنگالی لہجہ ملاتے ہوئے جواب دیا:۔

"ہمارا معاشرہ واقعی رُو بہ انحطاط ہے۔ اس انحطاط کا سب سے بڑا سبب ہندوستانی اور امریکی فلمیں ہیں۔ اِن فلموں نے نوجوانوں کے اخلاق کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے عادات و خصائل، وضع قطع، رہنے سہنے کے طور و طریق، زندگی کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر ـــ یہ سب متاثر ہو رہے ہیں۔"

بیس منٹ گزر چکے تھے۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے ایک اور سوال کیا:۔

"کیا اسلام کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے؟"

"جی نہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "اس کے برعکس ہمیں اپنے تقاضوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ قرآن اور سُنّت اسلام کی محکم اور ناقابلِ تغیر بنیادیں ہیں۔ سُنّت کے بغیر قرآن کے عملی نفاذ کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ہر عہد کے مسائل قرآن اور سنت کی روشنی میں حل کر سکتے ہیں اور جن معاملات میں یہ دونوں خاموش ہیں، ان میں ہم اسلام کے مزاج اور اس کی مجموعی سکیم کو سامنے رکھ کر قیاس سے کام لے سکتے ہیں۔"

"خانصاحب،" مَیں نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں اسلامی دولتِ مشترکہ کی تجویز کیسی ہے؟"

"تجویز تو یقیناً بہت اچھی ہے۔" ان کے لہجے میں امید اور حسرت کا ایک دھیما امتزاج تھا۔ "یہ تو ہر مسلمان کا نصب العین ہے کہ اسلامی ممالک میں اتحاد اور مرکزیت قائم کی جائے، لیکن یہ مرکزیت، خلافت کے بغیر قائم نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان ممالک کے موجودہ حالات تو بہت ہی زیادہ حوصلہ شکن ہیں۔ عرب ممالک آپس میں متحد نہیں۔ اکثر ممالک ایک دوسرے کے خلاف سرد جنگ لڑ رہے ہیں ـــ ہر طرف انتشار اور فکری انار کی کا دور دورہ ہے، تاہم ان تمام باتوں کے باوجود اگر اتحاد بین المسلمین کے لیے صحیح خطوط پر کام کیا جائے تو آگے چل کر اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔"

وقت دبے پاؤں گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے وقت کا پُورا پُورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سوال اور کر دیا:

"خانصاحب! کیا آپ کو زندگی میں قائداعظم سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا کہ وہ پاکستان کو کس نوعیت کی ریاست بنانا چاہتے تھے؟"

خانصاحب نے جواب میں فرمایا:

"مجھے قائداعظم سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا کبھی موقع میسر نہ آیا، تاہم ان کی تقاریر اور بیانات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ پاکستان کو ایک اسلامی اور جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کے ذہن میں اسلامی ریاست کی تفصیلات نہیں تھیں۔"

میرا آخری سوال یہ تھا:

"عائلی قوانین کے آرڈی نینس کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟"

انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ ایک سیاسی اور متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ میں سپیکر کی حیثیت میں اس موضوع پر اپنی رائے کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔"

وقت زیادہ ہو چکا تھا اور تمیزالدین خاں صاحب نڈھال ہوتے جا رہے تھے۔ ہم نے اجازت چاہی۔

چلتے وقت انہوں نے مصافحہ کیا۔ جب ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا اور ان کی نگاہیں ایک ثانیے کے لیے مجھ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں تو مجھے یوں لگا کہ ایک غیر مرئی رُو میرے جسم میں دوڑتی جا رہی ہے۔ مَیں نے خانصاحب کی نظروں کو پڑھا وہ کہہ رہی تھیں:

"ہمارا دَور بیت جانے کو ہے۔ اب قوم کی تعمیر اور قیادت کی ذمّہ داری آپ جیسے نوجوانوں پر عائد ہوتی ہے۔ دیکھنا اس مقدّس فریضے کی بجاآوری میں کوتاہی نہ کرنا۔"

مَیں نے عہد کیا کہ اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں قوم کی تعمیر و تشکیل میں لگا دوں گا اور اپنے خونِ جگر سے پیارے وطن کے گلشنِ حیات میں ایسے سدا بہار پھول کھلاؤں گا جن کی مشک ریزی مشامِ جان کو ہمیشہ معطّر کرتی رہے گی ۔۔۔ مَیں مادرِ وطن کی عزّت و ناموس کی جان پر کھیل کر حفاظت کروں گا۔

پروفیسر حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سے جب مجھے پہلی بار ملاقات کا شرف حاصل ہُوا تو مجھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ یہی وہ دبلا پتلا انسان ہے جو مختلف محاذوں پر اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ قومی اور تعمیری کاموں میں نہایت ہی خاموشی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ جب انہیں قریب سے دیکھنے کے متعدد مواقع میسر آئے تو مجھے محسوس ہُوا کہ اس مختصر سے جسم میں بجلیوں کی بے تابیاں سمٹی ہوئی ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے باوجود ابھی تک عزم جواں ہے، آرزوئے شوق کا سیل اب بھی اسی طرح تند و تیز اور سبک رَو ہے جس طرح عہدِ شباب میں جذبات کے طوفان اٹھا کرتے ہیں۔ میانہ قامت، مسکراتی ہوئی آنکھیں، جن سے معصومیت اور حیا ٹپکتی ہے، جب گردش کرتی ہیں تو دانائی کروٹیں لینے لگتی ہے۔ کشادہ پیشانی پر فکر و تدبر کی سلوٹیں ابھر ابھر کر اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ قلب و دماغ کے سمندر میں ذہنی رَوئیں چل رہی ہیں۔

پروفیسر صاحب قابلیت کا پیکرِ متحرک ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس سے خیالات کے چمنستان کھل گئے ہیں۔ فلسفے کی عرق ریزی نے پھولوں کے دامن پر شبنم کے موتی ٹانک دئے ہیں۔

ملک کے تعلیمی مسائل اور ضروریات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم ہو جو ہماری قومی امنگوں اور تصورات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ یورپ کے اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے اور اس سیاحت نے ان کے افقِ نگاہ کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ خواتین کی آزادی اور معاشرتی ترقی کے علمبردار ہیں لیکن اس آزادی کے نہیں جو عورت کو صرف شمعِ محفل بنا کر رکھ دے۔

حمید احمد خاں محبت بھرا دل رکھتے ہیں۔ وہ دل جو پوری انسانیت کے لیے دھڑکتا ہے۔ ہمدردی اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے — مگر جب اصول کا معاملہ آتا ہے تو وہ ہر محبت کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اصولوں کے معاملے میں وہ کسی "مصلحت" اور "مصالحت" کے قائل نہیں۔

وہ ایک نہایت ہی محتاط اور نپے تلے انسان ہیں۔ بہت ہی کم غیر ضروری باتیں کرتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر قدم اٹھاتے ہیں اور پھر استقلال کے ساتھ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں، مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسا دھیما اور سلجھا ہوا انسان جذباتی بھی ہو سکتا ہے — اتنے جذبات تو بہر حال ہونے ہی چاہئیں جو انسان کو مشین سے ممیز کر سکیں۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ ایک حد تک انسان میں جذبات کا ہونا "کچھ" کر گزرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

میں نے سب سے پہلے پروفیسر صاحب سے سوال کیا:۔

آپ اپنی زندگی کے کچھ اہم حالات و واقعات بتائیے۔ یعنی آپ نے کن کن سے اثر قبول کیا۔ کن کن ادوار سے گزرے اور کیا کھویا اور کیا پایا؟

حمید احمد خاں صاحب نے ایک پختہ کار استاد کے اندازِ تکلم کے ساتھ کہنا شروع کیا:۔

درحقیقت زندگی بھر اتنا مصروف رہا ہوں کہ کبھی ماضی پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نومبر ۱۹۰۳ء میں لاہور میں پیدا ہوُا۔ اسی سال چھ مہینے پہلے والد مرحوم نے لاہور سے اخبار "زمیندار" جاری کیا تھا۔ میں ابھی چھ برس کا تھا کہ والد (مولوی سراج الدین احمد خاں) کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ والد مرحوم کی زندگی کی کچھ جھلکیاں اور کچھ باتیں میری یاد میں اس حد تک محفوظ ہیں جس حد تک اس عمر میں رہ سکتی ہیں۔ ان کی ایک یاد یوں سامنے آتی ہے کہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے اخبار کے لیے مضمون لکھ رہے ہیں۔ ایک اور تصویر یوں نظر آتی ہے، شام کا وقت ہے اور وہ باغ میں اپنے ہاتھ سے باغبانی کر رہے ہیں۔ ہمارے بڑے باغ کے ساتھ ایک الگ تختہ پپیو کے درختوں کا ہے۔ مجھے بہلانے کے لیے کہہ رہے ہیں: دیکھو یہ چھوٹا باغ تمہارا ہے۔ ان بکھری بکھری یادوں سے قطع نظر، والد مرحوم ایک اخلاقی نصب العین کی حیثیت سے میرے دل میں ہمیشہ ایک زندہ ہستی کی مانند موجود رہے۔ مَیں اس تصوّر کے لیے اپنی والدہ صاحبہ کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے والد صاحب کی شخصیت کا ایک ایسا جامع تصوّر میرے سامنے رکھا جس سے مَیں زندگی کے ہر اہم موڑ پر رہنمائی حاصل کرتا رہا۔ ان کی فراست، خلوص اور راست گوئی کی جیتی جاگتی تصویر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی اور جب کبھی میرے سامنے کوئی اہم مسئلہ ہوتا تو مَیں اس انداز میں حل کرتا کہ اگر والد مرحوم کے سامنے یہ مسئلہ آتا تو وہ اسے کس طرح حل کرتے؟

غرض میری ابتدائی تربیت میری والدہ محترمہ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ وہ خاموشی سے نیک کاموں میں مصروف رہتیں۔ ہمدردی اور خدمت کے ساتھ ساتھ دینی روایات سے گہرا لگاؤ ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ ہمیں والد صاحب کی انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کے واقعات سناتی رہتیں۔ اس نوع کے واقعات سنتے رہنے کی وجہ سے میرے ذہن میں "انسان"

کا جو تصوّر قائم ہُوا تھا وہ یہ تھا کہ انسانوں کے کام آنا شرفِ آدمیت ہے۔ یہ تصوّر میرے قلب و ذہن میں پوری طرح رچ بس گیا اور یہی تصوّر میری سب سے قیمتی متاعِ زیست ہے۔ مَیں اپنی والدہ کا یہ احسان کبھی نہیں بُھلا سکتا کہ انہوں نے مجھے عمر کے اس حصّے میں شعورِ انسانیت کی روشنی عطا کی، جب بے شعوری کے سائے بہت گہرے ہُوا کرتے ہیں۔

اپنی تعلیم کے بارے میں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ مَیں نے ابتدائی ایّامِ تعلیم کا بڑا حصّہ وزیر آباد میں گزارا۔ بی۔اے کی تعلیم جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پاتا رہا۔ ایم۔اے۔ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔

جہاں تک میرے اساتذہ کا تعلق ہے، وہ سب کے سب ہی اچھے تھے لیکن ان میں سے تین چار اساتذہ کا خصوصی ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ بچپن میں جس استاد نے میری ذہنی سطح پر سب سے زیادہ گہرے نقوش مرتسم کیے ــــ ایسے نقوش جن کے اثرات آج بھی میری زندگی کے علمی گوشوں کا احاطہ کیے ہیں، وہ وزیر آباد کے مشن ہائی سکول کے مینجر ریورنڈ گریم بیلی تھے۔ وہ نویں اور دسویں جماعت میں ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے اور میری ذات پر ان کی بے شمار مہربانیوں کا ایک ثبوت یہ تھا کہ مجھے انگریزی زبان کے تلفظ اور لہجے کی مشق کراتے۔ انگریزی نظم کی موزونیت، مزاج اور لطافتوں سے آگاہ کرنے کی مسلسل سعی کرتے اور یہ انہی کی کاوشوں اور کاہشوں کا نتیجہ تھا کہ مَیں چھوٹی سی عمر میں انگریزی نظم کی موسیقی اور نغمگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو گیا تھا۔ اب میرے لیے انگریزی نظم، اردو نظم کی طرح موزونیت اور شعریت سے ہم آہنگ تھی۔

دوسرا اگر اثر مَیں نے جامعہ عثمانیہ کے دورانِ تعلیم میں پروفیسر مولوی عبدالباری ندوی سے قبول کیا۔ وہ علامہ شبلی کے شاگردِ خاص اور مشرقی تہذیب کے ایک نہایت ہی دلکش اور سچے مرقع تھے۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے استاد تھے۔ ان کی شفقت، طلبہ کی ذات میں ان کا گہرا انہماک، ان

کی حق گوئی و بے باکی، ان کی سادگی و میانہ روی، ان کی شخصیت کے نمایاں خدوخال تھے۔ ان اوصافِ حمیدہ نے میرے ان فطری رجحانات اور طبعی میلانات کو اور زیادہ نکھارا اور نتھارا جن کی ابتدا گھر کے ماحول میں ہوگئی تھی۔ فلسفے کے دوسرے استاد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم تھے۔ ان کی ذکاوتِ طبع اور تبحر کے خزانے شاگردوں کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے اور سچ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے بعد خلیفہ صاحب مرحوم کے علاوہ میں نے اور کوئی شخصیت ایسی نہیں دیکھی جس کے افکار کی وسعت اور گہرائی اس قدر سبق آموز ہو۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر لینگ ہارن کی عنایات مجھے خصوصیت سے یاد ہیں۔ انہیں مضامین کے تجزیہ و تنقیح پر ملکہ حاصل تھا۔ وہ مضمون کے ایک ایک لفظ پر تنقید اس انداز میں کرتے کہ مضمون نگار کا پورا ذہنی پس منظر سامنے آجاتا۔ ان کی اس ژرف نگاہی کی بدولت مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہُوا کہ خیالات کے صحیح تجزیے کی انسان کی فکری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ الغرض کس کس استاد کا نام لوں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی سے لے کر ڈاکٹر ڈ ویلٹی اور پروفیسر مدن گوپال سنگھ تک، ہر ایک سے مَیں نے کوئی نہ کوئی نکتہ سیکھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم جامعۂ عثمانیہ میں دینیات کے استاد تھے۔ انھوں نے "جاہلیتِ جدیدہ" کی ترکیب ایجاد کر کے تہذیبِ حاضر کو پرکھنے کے لیے ایک نیا نقطۂ نگاہ عطا فرمایا۔ پروفیسر مدن گوپال سنگھ نے (جو اگرچہ ملٹن کی نظم کو صحیح نہیں پڑھتے تھے) مجھے نثر کی اصلاح کا راستہ اس طرح دکھلایا کہ مَیں ان کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے ان سے یہ سیکھا کہ اظہارِ مطالب میں غیر ضروری استعاروں اور صنعتوں کا استعمال مطلقاً جائز نہیں ہوتا۔ صرف اتنے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں، جن سے مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے اور قاری یا سامع کو بات سمجھنے کے لیے لفظوں کے غیر ضروری پیچ و خم سے نہ گزرنا پڑے۔ اسی طرح ڈاکٹر ڈ ویلٹی سے مَیں نے یہ سیکھا کہ ڈراما کس طرح پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔ دراصل اپنے استادوں کے متعلق میری

احسان مندیوں کی داستان اتنی طویل ہے کہ مَیں اس کی پوری شرح اس مختصر وقت میں نہیں کر سکتا۔

پروفیسر صاحب! وہ کیا حالات تھے جن کی بناء پر آپ کو حصولِ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ جانا پڑا تھا؟

حمید احمد خاں صاحب نے جواب دیا:

"ابھی مَیں نے پنجاب یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ خلافت کی تحریک نے پورے برِ اعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس تحریک کا مجھ پر اتنا اثر ہُوا کہ مَیں نے فیصلہ کیا کہ اب صرف اس یونیورسٹی سے امتحان دوں گا جو انگریزی چارٹر کے تحت وجود میں نہ آئی ہو۔ پورے ملک میں ایسی درس گاہ صرف جامعہ عثمانیہ کی تھی۔ اس لیے حیدر آباد منتقل ہو گیا۔

تحریکِ خلافت کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

مَیں سمجھتا ہوں کہ خلافت کی تحریک بڑی حد تک ایک جذباتی تحریک تھی۔ اس کی تہہ میں سچا اسلامی جذبہ ضرور تھا، مگر اس تحریک کو کوئی فکری تنظیم اور سیاسی تدبّر نصیب نہ ہُوا۔ اس تحریک کے قائدین جذباتی انسان تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد — یہ سب کے سب اپنے سینوں میں جذبات کا کوہِ آتش فشاں رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی شعلہ بیانیوں اور سحر کاریوں سے مسلمانوں میں جذباتیت اور جوش و خروش کا ایک ایسا محشر بپا کیا کہ ان دنوں اس کے ہنگاموں کے سوا اور کچھ سنائی ہی نہیں دیتا تھا۔ حیدر آباد دکن کے دورانِ قیام میں میرے خیالات (کانگرسی تصورات) میں بنیادی تبدیلی آئی اور مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ خلافت کی تحریک سے ہندو فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسلمانوں کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس وقت تک یہ تحریک ویسے بھی اپنا زور ختم کر چکی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال نے آخری خلیفہ کو معزول کر کے وہ قصّہ ہی ختم کر دیا جس کی بناء پر تحریکِ خلافت کی تنظیم ہوئی تھی۔

کیا تحریکِ خلافت سے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا نہیں ہوئی؟

یوں تو ہر حرکت میں تعمیر کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے اور اس سیاسی تحریک نے بھی مسلمانوں میں ایک اجتماعی تنظیم ضرور پیدا کی۔ جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم جس ملک میں خلافتِ اسلامیہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس ملک کے داخلی حالات سے ہی ہم فی الواقع بالکل غافل تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خلافت کی بحالی تو ایک طرف رہی، ترکوں نے بہت جلد لادینی و لاطینی سے رشتہ جوڑ لیا۔ تحریکِ خلافت جیسی دینی و اسلامی تحریک کا یہ انجام مجھے بہت عبرت ناک معلوم ہُوا۔

آپ نے تعلیم و تدریس کے پیشے کو طبعی رجحانات کے زیرِ اثر اختیار کیا یا اتفاقیہ طور پر آپ اس راہ پر چل نکلے؟

مَیں نے بچپن کے کھیلوں میں مدرسی، اخبار نویسی، قصّہ نگاری وغیرہ کئی کھیل کھیلے ہیں۔ لیکن مدرسی کے پیشے کو جس استقامت کے ساتھ میں نے سینے سے لگا رکھا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ کہنا شاید درست ہو کہ مجھے مدرس بننے سے فطری لگاؤ تھا اور یہ کہنا تو بہر حال بالکل صحیح ہے کہ مَیں نے اپنی معلّمی کی زندگی پورے لطف اور دلی مسرت سے بسر کی ہے۔ مَیں اپنے شاگردوں کے معاملے میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں۔ ان کی ایک بڑی جماعت اب میرے زمرۂ احباب میں شامل ہے۔ بحیثیتِ مجموعی مجھے یہ کہنے میں بالکل تامّل نہیں ہے کہ مَیں خوش ہوں خُدا نے مجھے عمر بھر درس و تدریس کے کام میں لگائے رکھا۔

آپ نے انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی رائے میں انگریزی ادب کی کن کن خصائص کو اردو ادب میں منتقل کرنا ضروری ہے؟

انگریزی زبان و ادب کی بہت سی خوبیاں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ جو چیز ہم نے انگریزی سے اب تک نہیں سیکھی اور جس کے سیکھنے کی مَیں اب بھی اشد ضرورت سمجھتا ہوں وہ ہے نثر کے جملے کی

چست بندش — اور ہمارے اکثر اہلِ قلم لفظوں کے غیر محتاط استعمال سے پرہیز نہیں کرتے۔ یہ تجاوز ان سے اس لیے ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن کی منطقی حد بندی کرنے کے لیے ریاضت نہیں کی۔ جب تک نثر میں صحتِ بیان کی وہ کلید ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی، جو انگریزی کو بالعموم میسّر ہے، علمی تحقیق اور نئے افکار کی تخلیق کے دروازے ہم پر بالعموم بند رہیں گے۔ منطقی احتیاطوں سے گریز دراصل ایک ذہنی سستی کی علامت ہے اور یہ وہ مرض ہے جس میں ہماری قوم کے بے شمار افراد اب بھی مبتلا ہیں۔

اردو ادب کے کس انشا پرداز نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟

مَیں نے اوائلِ عمر میں قدرتی طور پر مولانا ظفر علی خاں کی تحریروں کا کثرت سے مطالعہ کیا اور میرا اپنا اندازِ تحریر مولانا کے اسلوبِ بیان سے بہت متاثر ہُوا۔ مولانا لفظوں کے بادشاہ ہیں۔ الفاظ کی وہ فراوانی تو مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی مگر عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ مَیں ایک اور خطرے سے بتدریج محفوظ ہوتا گیا جو اندازِ بیان میں لفظ و معنی کے عدمِ توازن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ایم۔ اے انگریزی کے طالب علمی کے زمانے میں جیسا کہ مَیں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، میرے دو استاد — پروفیسر لیگ ہارن اور پروفیسر مدن گوپال سنگھ آڑے آئے۔ اگرچہ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ انگریزی زبان سے عمر بھر کا تعلق بھی میری ذہنی تربیت کا باعث بنا۔

آپ کی رائے میں اردو زبان کو پاکستان میں کیا اہمیت حاصل ہے؟

اس موضوع پر مَیں اپنی رائے کا کئی بار اظہار کر چکا ہوں۔ مَیں نے انگریزی زبان کی تحصیل و تدریس پر زندگی کا ایک بڑا حصّہ صرف کیا ہے اور سچ پوچھیے تو میری معاش انگریزی زبان سے وابستہ ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میری دیانتدارانہ رائے ہے کہ پاکستان میں جس قدر جلد ہم اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دے دیں گے، اتنا ہی زیادہ ہمارے لیے بہتر اور سود مند ہوگا۔

اردو کو جلد از جلد صحیح معنوں میں قومی زبان کی حیثیت سے اپنا لینے میں بے شمار فوائد مضمر ہیں سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس زبان کے ذریعے کم از کم مغربی پاکستان کے مختلف حصّوں کے درمیان وحدت و یگانگت قائم کی جا سکتی ہے۔ پھر اردو زبان کی ایک بین الاقوامی حیثیت بھی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمارے ساتھ وابستہ رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی صورت میں معیارِ تعلیم یقیناً بہتر ہو جائے گا۔ اب تک صورتِ حال یہ ہے کہ طلبہ بغیر سوچے سمجھے انگریزی کے فقرے رٹتے ہیں اور انہیں امتحان کی کاپیوں میں نقل کر دیتے ہیں۔ مَیں اپنے تجربے کی بناء پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر طلبہ کو اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ زیادہ ذہانت اور معقولیت کے ساتھ سوالوں کے جوابات دے سکیں گے۔ انگریزی کی جگہ اردو زبان کو لانے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم اس ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے جس میں ہم ایک صدی سے مبتلا ہیں۔ جب تک ہم صرف انگریزی کتابوں کے ذریعے سے علم حاصل کرتے رہیں گے اس وقت تک ہم آزادی کے ساتھ سوچنے کے قابل بن ہی نہیں سکیں گے۔ ہمارے لیے ان تصوّرات اور معتقدات سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اثر قبول نہ کرنا قریباً ناممکن ہے جو انگریزی کتابوں میں اور انگریزی تمدّن میں سرایت کیے ہوئے ہیں، خواہ بعض صورتوں میں یہ تصوّرات ہماری قومی روایات سے بَیر ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ میکالے نے جب اس برِ عظیم میں انگریزی زبان کو ذریعۂ تدریس بنانے کی سفارش کی تھی تو اس نے اس سفارش کے مقصد کو پیش کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "اس طریقے سے ہم ہندوستانیوں میں سے انگریزی ذہن تیار کر سکیں گے"۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم نے نہ صرف ہمارے ذہنوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے بلکہ ہم اس احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ علوم و فنون کے

سارے سرچشمے صرف یورپ میں ہیں۔ آپ اندازہ کیجیئے کہ جو قوم اس قسم کے احساسِ کہتری کا شکار ہو وہ تحقیق و تخلیق کے میدان میں کب کوئی نیا قدم اٹھا سکتی ہے۔

پروفیسر صاحب، جب اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اختیار کرنے کے اتنے فوائد ہیں تو پھر اسے ذریعۂ تعلیم و تدریس بنا لینے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟

اردو زبان کی افادیت اور اہمیت اتنی واضح ہے کہ اب کسی کو اس کے خلاف کُھلّم کُھلّا کچھ کہنے کی جرأت نہیں، تاہم اردو زبان کو تدریسی اور دفتری زبان بنا لینے سے جس طبقے کے مفادات پر چوٹ پڑتی ہے وہ مختلف حیلے بہانوں سے اردو زبان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اونچے سرکاری افسران یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اردو زبان کو دفتری زبان بنا لیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کے ماتحت کلرک ان سے زیادہ اچھا اردو لکھ سکیں گے اور یہ بات افسران کی اہمیت اور ان کے تفوق کے حق میں نہایت ہی مہلک ثابت ہوگی۔ موجودہ نظامِ تعلیم بنایا ہی اسی اصول پر گیا ہے کہ ہر سال ایک سو کے قریب سی ایس پی آفیسرز تیار ہوتے رہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسے کلرک پیدا ہوں جو غلط انگریزی لکھیں تاکہ ان کے افسران ان کی غلطیوں کی اصلاح کر کے اپنے علمی تفوق کا رعب قائم رکھ سکیں۔

اس راہ کی دوسری بڑی رکاوٹ ہمارے اساتذہ ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی زبان میں نوٹس تیار کیے جنہیں وہ ہر سال طلبہ کو لکھوا دیتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تدریس کے باعث کوئی طالب علم استاد سے کسی علمی یا تحقیقی موضوع پر کوئی سوال نہیں کر سکتا کیونکہ اوّل تو وہ بات کو سمجھ ہی نہیں رہا ہوتا ہے اور اگر سمجھ بھی رہا ہو تو اسے سوال کرنے میں یہ خدشہ حائل رہتا ہے کہ کہیں وہ غلط انگریزی استعمال کر کے پوری جماعت کے لیے مضحکہ نہ بن جائے۔ یہ تمام باتیں استاد کو محنت و ریاضت سے نجات دلا دیتی ہیں لیکن اگر اردو ذریعۂ تعلیم بن جائے تو سب سے پہلے

تو خود استاد کو اپنا موضوع اچھی طرح سمجھنا پڑے گا۔ پھر اسے اردو میں سمجھانے کے لیے اور بھی زیادہ محنت کرنا پڑے گی اور سب سے زیادہ نازک صورتِ حال کا سامنا اسے اس وقت کرنا ہوگا، جب کوئی ذہین طالب علم سوال کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی مسلسل ریاضت اور مشقت کا تقاضا کرتی ہے اور محنت و مشقت سے جی چرانا ہماری پوری قوم کا خاصہ ہوگیا ہے۔

عام طور پر اربابِ اختیار کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس زبان میں درسی کتابیں موجود نہیں اور اس میں ہر نوع کے مفاہیم و مطالب کے اظہار کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان میں ہر طرح کے مفہوم کو بآسانی ادا کیا جاسکتا ہے۔ درسی کتابوں کی کمی کی شکایت بھی کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ اول تو درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام شروع ہوچکا ہے اور مانگ کے بڑھ جانے کے ساتھ ساتھ کام کی رفتار خود بخود تیز ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ درسی کتابوں کی فی الفور ضرورت نہیں۔ اگر اساتذہ اردو میں تدریس کا کام شروع کردیں تو طلبہ انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں سے از خود استفادہ کرلیں گے اور چند ہی سالوں کے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں معیاری درسی کتابیں تیار ہو جائیں گی۔

یہ تمام باتیں اتنی صاف اور واضح ہیں کہ ایک اوسط ذہن کا آدمی بھی انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن جب "عالی دماغ" حضرات ان حقائق سے پہلوتہی کرتے ہیں تو پھر عوام ان کی نیتوں پر شک کرنے لگتے ہیں اور بعض اوقات تو مجھے بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملک کا ایک بڑا سنجیدہ طبقہ رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کے حق میں ہے۔ آپ کے اس بارے میں کیا خیالات اور تاثرات ہیں؟

مجھے معلوم نہیں کہ ملک میں وہ کونسا ذہین طبقہ ہے جو رومن رسم الخط کا حامی ہے۔ میرے نزدیک

تو اس مسئلے کا تعلق ہماری زندگی کی بنیاد سے ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی مشین کے کسی پرزے کو تبدیل کر کے اس کی جگہ نیا پرزہ لگا دینے کے ہم معنی نہیں ہے۔ موجودہ رسم الخط سے ہماری دینی، روحانی، تہذیبی اور قومی روایات وابستہ ہیں۔ رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بعد ہمیں ان تمام ذخائرِ علوم سے عملاً محروم ہو جانا پڑے گا جن میں ہمارے آباؤ اجداد کا نہایت ہی بیش قیمت خونِ جگر شامل ہے۔ نامعلوم ہم ترکی کے تجربے سے سبق کیوں حاصل نہیں کرتے۔ وہاں تینتیس سال کے طویل عرصے میں صرف دو سو پرانی کتابیں نئے رسم الخط میں منتقل کی جاسکی ہیں۔ ترکوں نے مغربی زبانوں کی تحصیل میں سب سے زیادہ توجہ فرانسیسی زبان پر دی تھی۔ لاطینی رسم الخط کے اختیار کر لینے سے ترکی زبان کو یورپی زبانوں یا کم از کم فرانسیسی زبان کے قریب تر آجانا چاہیے تھا، مگر وہاں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی سے ترکی اور فرانسیسی زبانیں ایک نہ بن سکیں تو پھر یہ کہنا کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے اردو اور بنگلہ زبانیں ایک دوسرے کے قریب آجائیں گی، مجھے قرینِ صحت معلوم نہیں ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے مسئلے پر رائے عامہ اتنی منظم اور مضبوط ہے کہ آسانی کے ساتھ قوم کے حلق میں اس جان لیوا گھونٹ کو نہیں اتارا جاسکے گا۔

پروفیسر صاحب، طلبہ کے ہنگاموں اور شورش کی پشت پر کون سے عوامل کام کر رہے ہیں؟

میرے تجزیے کے مطابق طلبہ کے ہنگاموں کے حقیقی اسباب معاشی بدحالی، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان روابط کی ناخوش گواری یا یوں کہیے کہ عدم موجودگی اور موجودہ صورتِ حال سے حد درجہ بے اطمینانی ہے۔ بے پروائی سے بنائے ہوئے امتحانات کے پرچے بھی بارہا ناخوش گوار حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے طلبہ ایسے بزرگوں پر کس طرح بھروسہ کریں جو اپنے فرائضِ منصبی صحت اور دیانت داری سے ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان سب اخلاقی و معاشرتی امور سے

قطع نظر، جب آزادانہ اظہارِ خیال پر پابندیاں لگائی جائیں تو رُکے رُکے جذبات پھوٹ نکلتے ہیں اور ان میں شدت اور تیزی کا آجانا بالکل ایک فطری سی بات ہے۔

پروفیسر صاحب، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہمارے معاشرے میں زوال پذیری کے اثرات زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ آپ کی رائے میں یہ بات کہاں تک درست ہے؟

دراصل ہمارا معاشرہ اٹھارویں صدی سے روبہ تنزل ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس اخلاقی تنزل میں کوئی تیزی نہیں آئی، صرف آزادانہ اظہار کا موقع مل گیا۔ دولت کی لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں ہماری اخلاقی گراوٹ اور بھی ننگی ہو کر سامنے آگئی۔

کیا پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی نظریاتی کش مکش پائی جاتی ہے اور وہ کش مکش ہماری معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے؟

مسلمانوں کا سوادِ اعظم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کی شکل میں دیکھنے کا متمنی ہے، البتہ ایک چھوٹا سا طبقہ جو بدقسمتی سے با اثر بھی ہے، اسلامی زندگی اختیار کرنے سے گریز کی راہ اختیار کر رہا ہے۔ یہ گریز کی روش اور غیر اسلامی طور طریق سوسائٹی کو یقیناً متاثر کر رہے ہیں۔

آپ کے نزدیک اسلامی ثقافت کا مفہوم کیا ہے؟

ثقافت کا ایک قوم کے مذہبی معتقدات، اس کے ذہنی تصورات اور اس کے طبعی میلانات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ دراصل ثقافت انہی میلانات و احساسات کے ساتھ قوم کے دنیوی حالات اور مقتضیات کے ایک حسین اور دلکش اظہار کا دوسرا نام ہے۔ اسلام نے اس اظہار پر کچھ قیود عائد کی ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی ثقافت میں برہنہ رقص، عریاں لباس اور جسم کے ہیجان انگیز نمائش کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ جو حضرات یہ کام آرٹ اور ثقافت کے نام پر کر رہے ہیں، وہ نہ اسلام کے بہی خواہ ہیں اور نہ قوم کے خیر خواہ۔

ہمارے اس موجودہ معاشرے میں ایک مسلمان عورت کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے؟

میری رائے میں مرد اور عورت دونوں آگے بڑھنے اور اپنی شخصیت کو جلا دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ مجھے اس امر سے اتفاق نہیں کہ عورت کی دلچسپیوں کا مرکز صرف گھر ہے۔ اگر ایک عورت مجسٹریٹ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور وہ مجسٹریٹ بننے کی خواہش مند ہے تو میرے نزدیک اسے ایسا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ویسے بھی اس صنعتی دور میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ عورت بھی معاشی دوڑ میں حصّہ لے۔

لیکن پروفیسر صاحب، ہمارے ملک کے حالات یورپ کے ان حالات سے بڑی حد تک مختلف ہیں جنہوں نے عورت کو معاشی میدان میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یورپ نے دو عظیم جنگیں لڑی ہیں جن کے باعث وہاں مردوں کی قلت پیدا ہوئی اور اس بناء پر عورتوں کو معیشت کی ذمہ داریاں اٹھانا پڑیں لیکن ہمارے ملک میں بیروزگاری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اگر ہم عورتوں کو بھی معیشت کے میدان میں کھینچ لائے تو صورتِ حال اور بھی سنگین ہو جائے گی۔

صنعتی انقلاب کے علاوہ دنیا میں جو جمہوری انقلاب آچکا ہے وہ بھی اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ عورت کو مساوی حقوق دیئے جائیں۔ میرے لیے خواتین پر پابندیاں عائد کرنا نہ صحیح اسلام ہے اور نہ صحیح جمہوریت۔ وقت کا سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے اور اس کے آگے بند باندھنا لاحاصل ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم قدیم اور جدید کے مابین ایک خوش گوار امتزاج پیدا کر لیں۔

پروفیسر صاحب، کیا آپ کو یورپ کی سیاحت کا موقع ملا؟ اگر آپ یورپ گئے تو آپ نے وہاں کی تہذیب کو ہماری تہذیب سے کس قدر مختلف پایا اور کیا ان کی تہذیب کے کچھ اچھے پہلو ایسے بھی ہیں جنہیں ہم اپنا سکتے ہیں؟

میری ایک کمزوری یہ ہے کہ میری آنکھ دوسروں کے عیب دیکھنے کے لیے نہیں کھلتی۔ جو خوبی کسی

دوسرے میں ہو، مجھے بہت بڑی ہو کر نظر آتی ہے۔ مَیں نے انگلستان کے دو سالہ قیام میں بے شمار اخلاقی اور معاشرتی سبق سیکھے۔ اپنے ہم قوموں اور ہم جنسوں سے نہ صرف انصاف بلکہ مروّت کرنے کا جو سبق انگریزی سوسائٹی میں ملتا ہے، وہ شاید دنیا کی کوئی اور سوسائٹی نہیں دیتی۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق غصب نہیں کرتے۔ بڈھوں اور بچّوں کو دھکا دے کر خود پہلے بس پر سوار ہو جانے کا دہاں کوئی دستور نہیں ہے۔ رات کے وقت شور برپا کر کے ہمسایوں کی نیند خراب کرنے سے وہ لوگ خود بخود پرہیز کرتے ہیں اور کسی کو پولیس کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ لوگ خدائی فوجدار بن کر دوسروں کی زندگی میں دخل انداز نہیں ہوتے۔ وہاں سیاست دانوں کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کوئی غلط مطالبہ قوم سے منسوب کر کے اسے غلط طور پر منوانے کی کوشش کریں۔ رائے عامہ ہر وقت بیدار رہتی ہے اور ان معاملات میں کسی بڑے ہنگامے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ عوام کی دیانتداری کا معیار اتنا اونچا ہے کہ اخبار فروش بارہا اپنے اخبارات سڑک کے کنارے رکھ جاتا ہے۔ گاہک اخبار لے جاتے ہیں اور پیسے رکھ جاتے ہیں۔ مَیں نے بالخصوص اتوار کے دن بارہا اس قسم کے پیسوں کے ڈھیر سڑک کے کنارے جابجا دیکھے ہیں۔

آپ یہ تجربہ پاکستان کے کسی شہر میں کر دیکھئے۔ اگر آپ کو "اردو ڈائجسٹ" کے پرچے (یا ان کی فروخت کے پیسے) سلامت مل جائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیجئے۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ موقع ضرور آئے اور مَیں اپنے وطن میں وہ نظارے بھی دیکھوں جن کے لیے نگاہیں لڑکپن کے دنوں سے سراپا انتظار ہیں۔

ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدّین

یہ ۱۹۵۶ء کا ذکر ہے۔ اورینٹل کانفرنس کے اجلاس میں شمولیت کے لیے مَیں یونیورسٹی ہال میں داخل ہُوا۔ ہزاروں کی تعداد میں مندوبین اور شائقین موجود تھے۔ ہنگامے، خاموشی میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ اتنے میں استقبالیہ کمیٹی کی صدر سٹیج پر آئیں۔ وہ نقاب پوش خاتون ڈاکٹر مس خدیجہ فیروز الدین تھیں۔ ہر طرف کامل سناٹا تھا۔ حاضرین کی نگاہیں فرطِ عقیدت و احترام سے نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ تقریر کے الفاظ کانوں سے ٹکرا کر دل و دماغ میں غور و فکر کی لہریں پیدا کر رہے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس خاتون سے ملا جائے جو ایقان و اعتماد کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم کیے ہوئے ہے۔ بالآخر "اردو ڈائجسٹ" نے یہ موقع فراہم کر دیا۔

ڈاکٹر صاحبہ ملتان روڈ پر ایک خاموش کوٹھی میں رہتی ہیں۔ اس میں داخل ہو کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی تھک ہار کر سستا رہی ہو، تاکہ سفر کو ایک تازہ قوت کے ساتھ جاری رکھا جا سکے۔

مس خدیجہ صاف اور شستہ اُردو بولتی ہیں اور جب وہ باتیں کرتے ہوئے کچھ لمحوں کے لیے رک جاتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ حال کا مقابلہ ماضی سے کر رہی ہیں اور قوم کی متاعِ عزیز لُٹ جانے پر غمگین ہوں۔

ڈاکٹر خدیجہ اس نسوانی تہذیب و معاشرت کی نمائندہ ہیں جسے مشرق نے صدیوں سے اپنے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ وہ آٹھ زبانوں کی عالم، سوشل ریفارمر، سیاسی ورکر اور مختلف انجمنوں اور کانفرنسوں کی صدر ہونے کے باوجود۔ ایک مسلمان مشرقی خاتون ہیں اور جب ایک شخص نے مجھ سے کہا:

"الطاف صاحب، ہمیں ڈاکٹر مس خدیجہ پر فخر ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسلامی روایات کو قائم کیے ہوئے ہیں۔"

تو مَیں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے اس نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔

س : "آپ کی ابتدائی زندگی کس نہج پر گزری اور آپ کو گھر میں کیسا ماحول میسّر آیا؟"

ج : "مَیں بنوں میں پیدا ہوئی۔ میرے والد صاحب آغا محمد فیروز الدین وہاں کے محکمۂ تعلیم کے انچارج تھے۔ والدہ صاحبہ اور والد صاحب نہ صرف اسلامی ذہن رکھتے تھے بلکہ سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ اسلامی تعلیمات کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ میری والدہ محترمہ خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں، وہ اب بھی صوم و صلوٰۃ کی پوری طرح پابند ہیں۔ ان کی دینداری، خداترسی اور انسانیت سے محبت نے میرے ذہن پر انمٹ نقوش ثبت کیے اور میرے رگ و ریشے میں ایمان کی ایک ایسی برقی رَو دوڑا دی جو زندگی کے سرد تھپیڑوں میں بھی مجھے حرارت بخشتی رہتی ہے۔"

س : "آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کن حالات میں کیا اور تعلیمی دنیا میں کن کن مدارج کو طے کیا؟"

ج : میری تعلیم کا آغاز یورپین سکولوں سے ہُوا، لیکن چونکہ گھر کا ماحول ایمان و ایقان کی فضا لیے ہوئے تھا، اس لیے ان سکولوں کی بے دینی مجھ پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہوئی۔ ایف اے کینارڈ کالج لاہور سے کیا۔ یہاں کا ماحول میرے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھا۔ میرے دینی عقائد کی وجہ سے پورا ماحول میرے لیے اجنبی سا تھا،

لیکن اس ماحول کے خلاف کشمکش میں جو لذت تھی، اسے مَیں کبھی بھی بھُلا نہ سکوں گی۔ بی۔اے کانونٹ سے کیا، یہاں کے اساتذہ مذہبی امور میں کافی روادار تھے لیکن ان کی یہ مسلسل کوشش رہی کہ وہ کسی طرح مجھے عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کرلیں۔ محبت اور شفقت کے نام پر کئی جال بچھائے گئے۔ یہ مرحلہ میرے لیے نہایت ہی نازک تھا۔ مخالفت ہو تو مدافعت کا احساس بھی تیز ہو جاتا ہے لیکن محبت آمیز باتوں کا فریب انسان بڑی سادگی سے کھا جاتا ہے۔ خدا کا فضل رہا اور مَیں دامِ ہم رنگِ زمین سے بچتی رہی۔ تاریخ میں ایم۔اے کیا۔ ایم او، ایل کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں سرحد کے مشہور شاعر، متبحر عالم اور مردِ میداں، خٹک پر تحقیقی کام کیا اور ڈی لِٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اگر اسے خود ستائشی پر محمول نہ کیا جائے تو اتنا اور عرض کر دوں کہ پورے پاکستان میں صرف دو ڈی لِٹ ہیں۔ ایک مَیں اور دوسرے ڈاکٹر سید عبداللہ۔"

س : "ڈاکٹر صاحبہ، ایم،اے کرنے کے بعد آپ کے مشاغل کیا رہے؟"

ج : مجھے تعلیمی شعبے سے بچپن ہی سے خاص لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ غالباً اس لیے پیدا ہو گیا تھا کہ والد صاحب محکمۂ تعلیم میں کام کرتے تھے، چنانچہ مَیں نے تعلیمی میدان کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ برسوں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ نو سال سے زیادہ سٹیٹ فرٹڈ گورنمنٹ کالج برائے خواتین، امرتسر کی پرنسپل رہی۔ ۱۹۴۷ء میں مجھے محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹریس کی آسامی پر تعینات کیا گیا۔ مَیں نے تین سال تک اس حیثیت سے کام کیا اور پھر ملازمت سے سبکدوش ہو گئی۔ ع

نئی فضائیں ہمیں راس آ نہ سکیں

س : "اپنی بیس سالہ تعلیمی زندگی کے کچھ تجربات بتائیے۔"

ج : زندگی کے تجربات اتنے متنوع اور بوقلموں ہیں کہ سوچتی ہوں کسے بیان کروں اور کسے نہ کروں۔ دراصل زندگی کا ہر سانس بجائے خود ایک تجربہ ہے۔ ایسا تجربہ جو اپنے اندر شوق اور عبرت کے بے شمار پہلو لیے ہوئے ہے۔ مَیں نے زندگی کے اس طویل سفر میں سب سے زیادہ اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اہلِ شوق

کے لیے نہایت ہی ناموافق حالات میں بھی کام کرنے کے راستے مل جاتے ہیں۔ اپنے دورانِ ملازمت میں ان گنت پابندیوں اور بے شمار زنجیروں کے باوجود میں مسلم خواتین میں مذہب اور تعلیم کی تبلیغ کرتی رہی۔ مسلم سوسائٹی کے گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مسلم خواتین کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر معاشرے میں کوئی بنیادی اور خوش آئند انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے میں نے مختلف تنظیمیں بنائیں جن میں آل انڈیا مسلم ویمن ایسوسی ایشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کیے اور ہفتہ وار اجتماعات کے ذریعے خواتین میں حصولِ علم کے لیے شوق پیدا کیا اور اس طرح جو خواتین پڑھ لکھ گئیں ان کے لیے تعلیمی میدان میں سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش کی۔

میرا دوسرا تجرباتی تاثر یہ ہے کہ اگر اخلاص، دیانتداری اور بے غرضی سے کام کیا جائے تو اس کے ضرور اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ نتائج کی برآمدگی کا سلسلہ قدرے دھیرا اور صبر آزما ہوتا ہے۔ مجھے جن حالات میں کام کرنا پڑا، وہ نہایت ہی حوصلہ شکن تھے۔ ہر طرف انگریز، ہندو اور سکھ چھائے ہوئے تھے، مسلمان انتہائی تاریکی اور ظلمت کے ماحول میں تدبیر کے تیر چلا رہے تھے۔ جب میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے ساتھ ایک مشن لے کر اُٹھی تو مجھے یوں محسوس ہُوا کہ ارد گرد کا ماحول مجھے ایک قدم بھی نہ چلنے دے گا لیکن نصرتِ ایزدی اور مقصد سے شیفتگی نے مجھے حیرت انگیز کامیابی عطا کی۔ اور میں فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہوں کہ علم و فضل کے نسوانی گلدستے جن سے ملک کی رنگینی اور بہار قائم ہے ان کی آبیاری اور نگہداشت میں میرا بھی کچھ حصّہ ہے۔

اس سلسلے کی تیسری بات یہ ہے کہ اصولوں کے ساتھ چمٹے رہنا ہی انسان میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ جو اشخاص ہر اُبھرنے والی نئی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتے ہیں، وہ دراصل کسی کو متاثر نہیں کر سکتے۔ میں پردے کی سختی سے پابند رہی ہوں۔ اگرچہ مجھے اس پردے کی وجہ سے بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑے اور مجھے اس کی وجہ سے "اپنوں" ہی کی پھبتیاں اور طنز آمیز باتیں سننی پڑیں لیکن جو قلب و نظر

کے مالک ہیں وہ پردے کی وجہ سے میرا بے حد احترام کرتے ہیں اور یہ شاید آپ کے لیے باعثِ حیرت ہو کہ غیر مسلم میری اس قدامت پسندی کو اور بھی عزت اور تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر مبیل میتھوس مجھے ملنے آئے۔ وہ اس سے قبل ہندوستان کی ان معروف مسلم خواتین سے بھی مل چکے تھے جو پردہ نہیں کرتی تھیں۔ پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے متعلق اپنے تاثرات اپنی کتاب "انڈیا ریویلز اٹ سیلف" میں بیان کیے ہیں۔ وہ غالباً میری "باپردگی" سے اتنے متاثر ہوئے کہ مجھے ہندوستان کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ قرار دیا۔ مجھے اقبال کا یہ شعر بار بار یاد آرہا ہے ؎

اس دَور میں سب مٹ جائیں گے ہاں! باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکّا اپنی ہٹ کا ہے

س : "آپ کے نزدیک پاکستانی معاشرے کے تعلیمی تقاضے کیا ہیں؟"

ج : پاکستانی معاشرے کے تعلیمی تقاضے بالکل واضح ہیں۔ ہماری قوم کو ایک ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک طرف افراد میں دینی روح پھونک دے اور دوسری طرف قوم اور وطن کے تقاضے ان میں اس طرح پیوست کر دے کہ وہ احساسِ ذمہ داری اور پاکیزگی کردار کے ساتھ انہیں پورا کرنے کے لیے اپنے اندر ایک ناختم ہونے والی خلش محسوس کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے جہاں ہمیں نصابِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے، وہاں اس سے بھی زیادہ اشد ضرورت ایسے اساتذہ کی ہے جو اپنے مثالی کردار سے طلبہ میں اچھی صفات پیدا کریں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مَیں گورنمنٹ کالج امرتسر کی پرنسپل تھی تو مجھے اپنی طالبات کو نماز کے لیے بہت ہی کم تلقین کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مَیں اور میرا مسلم سٹاف باقاعدگی سے نماز ادا کرتا تھا اور ہمارے اس عمل سے لڑکیاں خاموش لیکن گہرا اثر قبول کرتی تھیں۔ اس تجربے اور تجزیے کی بناء پر مَیں تعلیم میں استاد کو بنیادی حیثیت دیتی ہوں اور ساتھ ہی یہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اچھے استاد اسی وقت حاصل کیے جا سکیں گے جب سوسائٹی انہیں

باعزت اور باوقار مقام دینے کے لیے تیار ہو۔ معاشی بدحالی اور معاشرتی کہتری کے شکار اساتذہ نوجوان نسل میں زندہ اور صحت مند تصورات اور احساسات پیدا نہیں کر سکتے۔

س : تعلیمی کمیشن نے جو سفارشات پیش کی ہیں آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ج : نئی حکومت کے سربراہ جس عزم اور خلوص کے ساتھ اصلاحی کام کر رہے ہیں، وہ قابلِ قدر اور حوصلہ افزا ہیں۔ تعلیمی نظام بھی اصلاح طلب ہے۔ اس لیے حکومت اس میدان میں بھی کام کرنا چاہتی ہے لیکن سفارشات سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ انہیں کس جذبے اور کس نقطۂ نگاہ سے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اور چونکہ اصلاحِ تعلیم کا میدان دوسرے اصلاحی میدانوں سے زیادہ اہم اور نازک ہے اس لیے یہاں کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر بہت زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ انسانی ذہنوں کی پرورش اور تربیت کا کام بالغ نظری، صحت مند قوتِ فیصلہ اور بے پناہ خلوص و دیانت کا تقاضا کرتا ہے۔

وطن سے محبت اور تعلیمی میدان کا تجربہ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں تعلیمی سفارشات کے بارے میں اپنی دیانتدارانہ رائے پیش کروں۔ میرا خیال ہے کہ ان سفارشات کے چند پہلو خاص طور پر غور طلب ہیں:

اوّل: طلبہ اور طالبات پر مضامین کا بوجھ زیادہ پڑ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اخراجات میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ تعلیمی اخراجات پہلے ہی غریب والدین کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔

دوم: امتحانات کے زیادہ ہونے کی وجہ سے طلبہ میں صرف امتحان پاس کرنے کی ذہنیت ابھرے گی اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ ذہنیت حصولِ علم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

سوم: سفارشات میں استاد پر اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے کہ وہ دیانتداری سے اپنے تمام فرائض ادا کر ہی نہیں سکے گا۔ آخری بات یہ ہے کہ ڈگری کے سہ سالہ کورس کی وجہ سے مدتِ تعلیم میں ایک سال کا اور اضافہ ہو جائے گا اور ہمارے ملک میں جہاں اوسط عمر پہلے ہی بہت کم ہے، یہ اضافہ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

س : آپ کے خیال میں معاشرے کی اصلاح و تعمیر میں عورت کیا کردار ادا کر سکتی ہے ؟

ج : خاندانی زندگی میں عورت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عورت پورے خاندان پر فیصلہ کن اثر ڈالتی ہے۔ بچے، باپ کے مقابلے میں ماں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں اور ماں کو ان کی تربیت و نگہداشت کے زیادہ مواقع میسّر آتے ہیں، اس طرح ماں کی حیثیت سے وہ بچّوں کی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بیوی اور بہن کی حیثیت سے بھی اس کا دائرۂ کار اچھا خاصا وسیع ہے۔ وہ اپنی سادگی، خلوص اور اچھے کردار سے مردوں پر کئی پہلو سے اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی شرم و حیا کی حفاظت کرتے ہوئے رفاہی اور تعمیری کاموں میں حصّہ لے کر معاشرے کو بہت کچھ دے سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری بہت سی سماجی خرابیاں عورتوں کی کج روی اور بے اعتدالی کی پیداوار ہیں۔ اگر خواتین اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو بدل دینے کا عزم کر لیں تو اس کے نتائج ہمہ گیر اور نہایت ہی خوش آئند نکلیں گے۔

س : پاکستانی عورت کی سرگرمیوں کا مرکز گھر ہونا چاہیے یا گھر سے باہر کی سوسائٹی ؟

ج : پاکستانی عورت کی توجہ کا بنیادی مرکز گھر ہی کو ہونا چاہیے لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ ہماری جو عورتیں گھروں میں رہتی ہیں انہیں جاہل اور دقیانوسی خیال کیا جانے لگا ہے۔ اب ہمارا معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے: ایک ایسی عورتیں جو گھروں سے بالکل باہر نہیں نکلتیں — اور دوسری وہ عورتیں جو گھروں میں بالکل نہیں گھستیں۔ یہ افراط و تفریط کسی صورت میں بھی ہمارے لیے مفید نہیں۔

س : آپ کے ذہن میں اسلامی ثقافت کا کیا مفہوم ہے ؟

ج : میرے نزدیک اسلامی ثقافت سے یہ مراد ہے کہ ذہن و فکر کو ارتقائی منازل سے اس طرح گزارا جائے کہ زندگی اعتدال اور توازن کا ایک حسین مظہر بن جائے۔ ذہن و فکر کی یہ پاکیزگی، ضبطِ نفس اور ضبطِ عبودیت سے پیدا ہوتی ہے۔ باقی رہا یہ نظریہ کہ فنونِ لطیفہ ذہن کی تطہیر اور اس کے جمالیاتی ترفیع کا ذریعہ ہیں، اس کے بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شریعت میں اس نظریے کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ انفرادی طور پر اگر

آپ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کچھ کرلیں تو شاید اس کی کچھ گنجائش نکل آئے، لیکن بڑے پیمانے پر پوری قوم کو موسیقی، مصوّری اور رقص و سرود کا رسیا بنا دینا اسلام کی منشا کے بالکل خلاف ہے۔ صوفیائے کرام میں موسیقی سے دل بستگی کا سبب زندگی سے گریز اور کنارہ کشی اختیار کرنا تھا۔ آگے بڑھنے والی قومیں کشمکشِ حیات کے ہر تار سے روح پرور نغمے سنا کرتی ہیں۔

س : ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے جس تیزی سے انحطاط پذیر ہے، اس کی روک تھام کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے ؟

ج : اصلاحِ معاشرہ کا کام صحیح طور پر اسی طرح سرانجام پا سکتا ہے کہ ہم سب مل کر اپنے اپنے دائرے میں اصلاحی کوششیں شروع کردیں، لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ حکومت کے پاس ذرائع و اسباب بہت وسیع ہیں اور وہ ان سے حکمت کے ساتھ کام لے کر بہت ہی قلیل عرصے میں ذہنوں میں انقلاب لا سکتی ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے کہ عوام بااثر اور اونچے طبقوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر حکومت کے ذمہ دار اراکین، دولت نمائی اور تعیش کوشی اور بے اعتدالیوں کی مثالیں قائم کرتے رہیں تو انفرادی مساعی بے اثر ہو کر رہ جائیں گی۔ بعینہٖ اگر حکومت کے ذمّہ دار افراد مختلف مواقع پر یہ تاثّر دیں کہ ان کے نزدیک مذہب اور صوم و صلوٰۃ کی کوئی اہمیت نہیں، تو ظاہر بات ہے کہ واعظوں کی انتھک کوششوں کے مقابلے میں عوام حکومت کے پیدا کردہ تاثّر کو زیادہ تیزی سے قبول کریں گے۔ اسی طرح اگر حکومت کے ذمّہ دار افراد اپنے عمل سے اچھی مثالیں قائم کرتے چلے جائیں، تو عوام بہت جلد اسی قسم کی مثالیں قائم کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے۔ اس تجربے کی بناء پر اصلاحِ معاشرہ کا آغاز حکومت کی طرف سے ہونا چاہیے۔ عوام حکومت سے تعاون کر کے کوششوں کو بار آور بنانے میں ہاتھ ضرور بٹا سکتے ہیں، لیکن حکومت کے مقابلے میں کوئی علیحدہ نظامِ اصلاح قائم نہیں کر سکتے۔ بالخصوص اس صورت میں جب حکومت بھی اپنی ہو۔

س : جیسا کہ آپ کی باتوں سے پتہ چلتا ہے۔ آپ نے مختلف ممالک کی سیاحت کی ہے، ان ممالک کے بارے میں آپ اپنے کچھ تاثرات بتائیے۔

ج : جی ہاں، مجھے مختلف ممالک میں جانے کا اتفاق ہُوا ہے۔ اسلامی ممالک میں بھی گئی ہوں اور غیر اسلامی ممالک میں بھی۔ یورپ کے اکثر ممالک میں نے دیکھے ہیں اور وہاں کے معاشروں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ روس اور پولینڈ کے نظامہائے زندگی کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ ہر ملک کا معاشرہ اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتا ہے۔ اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب بڑی تیزی سے قوّت پکڑتی جارہی ہے۔ یورپ کی عورتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ وہ سادگی اور محنت کا ایک حسین مُرقّع ہیں۔ زرق برق لباس وہ بہت ہی کم استعمال کرتی ہیں اور نہ ہی نمود و نمائش کے لیے ان کے پاس وقت ہوتا ہے۔ وہاں وزیروں کی بیویاں بھی ایک عام عورت کی طرح مصروفِ کار رہتی ہیں اور ان میں امارت یا منصب کی بُو تک نہیں ہوتی۔ رُوم کی عورتیں بے حد حسین اور نازک ہونے کے باوجود بلا کی محنتی ہیں۔ پولینڈ بہت زیادہ پس ماندہ ملک ہے۔ اس کا وسیع علاقہ ابھی تک غیر آباد ہے، لیکن یہاں کے لوگ صبح سویرے اٹھتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں۔ یورپ میں لوگ عموماً صبح سویرے نہیں اٹھتے۔ یہاں رہائشی مکانات کی بے حد قلت ہے اس وجہ سے لوگ اپنے گھروں میں کھانا نہیں پکا سکتے۔ وہاں زیادہ تر ہوٹلوں کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ یہ ہوٹل کچھ زیادہ گراں نہیں ہیں۔ ایک خاتون نے بتایا کہ گھر پر کھانا پکانے سے کوئی بچت نہیں ہوتی۔ ڈنمارک ایک زرعی ملک ہے اور یہاں کے باشندوں نے زراعت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

روس میں کل ۱۴ ری پبلک ریاستیں شامل ہیں جن میں سے سات مسلم ریاستیں ہیں۔ ان ریاستوں کا ماسکو کے مسلمانوں سے کوئی رابطہ نہیں۔ مسلم ری پبلکس میں مسجدیں آباد ہیں، لیکن یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دین کی روح قبض کر لی گئی ہے۔ اگر وہاں کے لوگوں کو صرف سجدے کی اجازت ہے تو اس اجازت کا

یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ وہاں اسلام آزاد ہے۔ مَیں نے وہاں کے علماء سے خطاب کیا اور انہیں اس بات کا احساس دلایا کہ ع

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

روس میں رہ کر دو تین چیزیں اور سامنے آئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حکومت زیادہ توجہ بچوں کی پرورش و تربیت پر دیتی ہے۔ وہاں کے حکمران طبقے کا یہ خیال ہے کہ اگر بچوں کے ذہن میں اشتراکی نظریات راسخ کر دئیے جائیں، تو پھر نوجوانوں کی دیکھ بھال پر توجہ دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ روس کی سیاسی زندگی کا یہ پہلو بھی میرے سامنے آیا ہے کہ عوام میں سے کیمونسٹ پارٹی کے بہت ہی کم ممبر ہیں۔ دراصل کیمونسٹ پارٹی حکمران طبقے کی جماعت ہے اور نفسیاتی طور پر عوام میں حکمران جماعت کے خلاف عموماً ایک نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ سیاسی پارٹی عوام میں بہت ہی کم گہری جڑیں رکھتی ہے۔

اور میرا آخری سوال یہ تھا:

س : بعض خواتین کی طرف سے یہ آوازیں آ رہی ہیں کہ پردہ عورت کی ترقی کی راہ میں حائل رہا ہے اور حائل ہے۔ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

ج : الطاف صاحب، آپ اس سلسلے میں میری رائے پوچھتے ہیں! کیا میرا یہ نقاب میری رائے کا کھلا اعلان نہیں؟ مَیں نے پوری زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر دی کہ مَیں عملی طور پر یہ ثابت کر دوں کہ پردے کی حدود میں رہتے ہوئے علم و عمل کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمویا جا سکتا ہے۔ مَیں نے علمی، دینی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی الغرض ہر شعبۂ زندگی میں حصّہ لیا۔ مَیں نے انجمنیں بنائیں، انہیں چلایا۔ مَیں ملک کے اندر اور باہر کانفرنسوں میں شمولیت کرتی رہی اور ڈٹ کر اپنے مؤقف کے حق میں تقریریں کیں۔ مَیں نے اورینٹل کانفرنس لاہور منعقدہ (۱۹۵۶ء) میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ متعلقہ اصحاب جانتے ہیں کہ وہ ردِ عمل کیا

تھا۔ میں نے اسی نقاب کے ساتھ بے شمار ممالک کی سیر کی۔ وہاں کے ذہین طبقوں سے خطاب کیا اور اپنے دل کا درد فضا کی کھلاہٹوں میں بکھیرتی رہی اور یہ برقع میری راہ میں کبھی حائل نہ ہؤا۔ جو خواتین اسے ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ تصوّر کرتی ہیں، دراصل ان کے نزدیک ترقی کا مفہوم ہی دوسرا ہے۔ اگر ترقی سے مراد نسوانی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر کے سوسائٹی کی خواہشات کا کھلونا بننا ہے تو یقیناً پردہ ایسی ترقی کی راہ میں ایک سنگِ گراں ہے، لیکن کیا اسلام ایسی ہی ترقی پسند عورت کی تخلیق کے لیے آیا تھا؟

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

گلبرگ کی جنّت نظیر بستی میں فوارے کی ہلکی ہلکی پھوار سے بننے والے دائروں کے قریب جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کا خوبصورت بنگلہ شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ اس بنگلے میں "صاحب پھول" کی پیوند کاری نظر نہیں آتی، بلکہ "دیسی پھول" اپنے رنگ و بو سے ماحول کو فردوس بداماں اور عطر بیز کیے ہوئے ہیں۔ ہوادار گیلری سے ملحق ملاقات کا کمرہ ہے جہاں علم و ادب کے مشتاقین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کمرے میں چاروں طرف مطالعے کی کتابیں شیلف میں قرینے سے رکھی ہوئی ہیں، صرف زینت کے لیے نہیں، ان میں کھو کر قلب اور دماغ کی طمانیت اور جلا حاصل کرنے کے لیے۔

وقتِ معین پر ہم بنگلے کے سامنے تھے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ رحمٰن صاحب تشریف لائے، سلام و مصافحہ کے بعد یوں بے تکلف باتیں ہونے لگیں جیسے ہمارے برسوں کے دوستانہ تعلقات ہیں۔

جسٹس رحمٰن محبت و شفقت کا ایک حسین پیکر ہیں۔ ان کی آنکھوں سے مسکراہٹوں کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ چہرے مہرے میں جوانی کی شگفتگی اور شوخی و ظرافت کچھ اس حسنِ تناسب سے موجود ہیں کہ زندگی ایک سہانا

خواب محسوس ہونے لگتی ہے۔ لب لہجے میں شہد کی سی مٹھاس اور زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی۔ آپ ان سے گھنٹوں باتیں کیجئے، کیا مجال جو آپ ایک سیکنڈ کے لیے بھی بوریت محسوس کریں۔

تعارف کے بعد اثر صہبائی صاحب نے جسٹس رحمٰن صاحب سے کہا:

"یہ دونوں آپ کی زیارت کے مشتاق تھے۔"

رحمٰن صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"مجھ میں زیارت والی تو کوئی بات نہیں۔"

انٹرویو کا آغاز ہوا۔ میں نے حالاتِ زندگی کے بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے جو کچھ بتایا اور میں نے جو کچھ تاثر لیا، اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں:۔

"جسٹس رحمٰن ۴ر جون ۱۹۰۳ء کو وزیرآباد (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے نہایت محنتی اور خاموش طبع تھے۔ اپنی قابلیت کی بدولت ہمیشہ سرکاری وظائف حاصل کرتے رہے۔ میٹرک میں آرٹس کے مضامین میں پنجاب بھر میں دوم رہے۔ بی۔ اے میں ریاضی کے آنرز سکول میں تمام صوبے میں اوّل رہے۔ ۱۹۲۶ء کے امتحان مقابلہ آئی سی ایس میں تیسرے نمبر پر رہے۔ غالباً پورے ہندوستان میں آپ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس امتحان میں اتنی نمایاں حیثیت حاصل کی۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے آپ کو تربیت کے لیے انگلستان بھیجا گیا جہاں آپ آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور اپنے تربیتی کورس کے علاوہ السنہ شرقیہ میں فرسٹ کلاس اور آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۲۸ء میں آپ انگلستان سے واپس تشریف لائے اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ کمشنر، ایس۔ ڈی۔ او، سیشن جج کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں آپ پہلی بار لاہور ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ آزادئ برِصغیر پاک و ہند سے پہلے بنگال سرحدی کمیشن کے ممبر بن کر کلکتے تشریف لے گئے۔ اس کام سے فراغت پانے کے بعد پھر لاہور ہائیکورٹ میں تشریف لے آئے۔ ۱۹۵۴ء میں آپ

لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور ازاں بعد ۱۹۵۸ء میں سپریم کورٹ میں بطور جج منتقل ہوئے اور آج کل آپ اسی عہدے پر فائز ہیں۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا:

"وہ کیا خاص واقعات اور اتفاقات تھے جنہوں نے آپ کو شعر و ادب کی طرف مائل کیا؟"

آپ نے جواب میں فرمایا:

"بظاہر یہ ایک حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ریاضی کے طالب علم کا ادب سے بھی تعلق ہو اور پھر یہ تعلق اتنا بڑھ جائے کہ ادب ریاضی کو ڈھانپ لے۔ تاہم میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ ۱۹۲۲ء کا زمانہ تھا میں ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ ادب سے کچھ شروع ہی سے لگاؤ تھا۔ میں "راوی" میں انگریزی کے مضامین لکھتا اور وہ اچھے خاصے پسند کیے جاتے۔ ایک دن میرے انگریزی کے پروفیسر مسٹر فرتھ (FIRTH) نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ کیا تم اردو زبان میں بھی لکھتے ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر انہوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مجھے ترغیب دی کہ میں اردو میں لکھنے کی کوشش کروں، کیونکہ مادری زبان کو اظہار کا ذریعہ بنائے بغیر خیالات میں اپچ اور بے ساختہ پن پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے پروفیسر موصوف کی اس تحریک پر اردو زبان میں مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے جنہیں کالج کے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ انہی دنوں میں کسی نے مجھ سے طنزاً یہ کہا کہ تم نثر تو لکھ لیتے ہو، مگر نظم لکھنے کی تم میں صلاحیت نہیں۔ اس چیلنج نے میری صلاحیتوں کو مہمیز لگائی اور میں نے اس کوچے میں بھی قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے اقبال کی ایک نظم کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کی اور وہ کوشش خاصی کامیاب رہی۔ اسی مرحلے پر میرے فارسی کے پروفیسر جناب قاضی فضل حق نے مجھے بلا کر کہا کہ میں "راوی" کے اردو حصّے کی ادارت سنبھال لوں، لیکن مجھے اس گراں بار ذمہ داری کو سنبھالنے میں تامّل تھا، تاہم اگلے سال مجھے یہ بوجھ اٹھانا ہی پڑا اور میں غالباً ایک سال تک ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا۔

۱۹۲۴ء میں آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان میں بیٹھا۔ میں نے اردو اور فارسی کے مضامین کا انتخاب

کیا تھا۔ مَیں نے ان دونوں زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کی درمیانی مدّت میں مجھے ٹریننگ کے لیے آکسفورڈ بھیج دیا گیا۔ وہاں مَیں نے شہرہ آفاق پروفیسر مارگولیتھ سے عربی پڑھی۔ اس طرح مجھے ان تینوں زبانوں کی اچھی خاصی شد بد حاصل ہو گئی اور آج اردو زبان و ادب سے میری گہری وابستگی انہی عوامل کا نتیجہ ہے۔"

میرا تیسرا سوال یہ تھا:

"آپ کو اقبال سے جو گہری عقیدت ہے وہ کن وجوہ کی بناء پر ہے اور اس عقیدت و شیفتگی نے کون کون سے ارتقائی مدارج طے کئے؟"

رحمٰن صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں جواب دیا:

"طالب علمی ہی کے زمانے میں مجھے اقبال کے کلام سے ایک گونہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ سکول میں اکثر اقبال کی مقبول نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال اپنا کلام سناتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ انجمن کا سالانہ جلسہ شیرانوالہ دروازے میں ہُوا۔ اقبال نے اپنی طویل نظم "خضرِ راہ" زبانی سنائی۔ ان دنوں میرا حافظہ بھی اچھا خاصا تیز تھا۔ وہ ساری کی ساری نظم مجھے اسی وقت یاد ہو گئی۔ غالباً حافظے سے زیادہ کام اس قلبی تعلق نے کیا جو مجھے اقبال کے ساتھ تھا۔

اقبال سے میری پہلی اور آخری ملاقات نہایت ڈرامائی انداز میں ہوئی اور اس ملاقات کے نقش میرے ذہنی افق پر ابھی تک بالکل تازہ ہیں۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ اقبال کے شیدائیوں نے اقبال ہی کی زندگی میں یومِ اقبال منایا۔ اس روز میرے دوست صوفی صاحب میرے مکان پر آئے۔ مَیں ان دنوں لاہور میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ صوفی صاحب نے علامہ اقبال کے مکان پر جانے کے لیے کہا، مَیں فوراً تیار ہو گیا اور ہم دونوں علامہ کی اقامت گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں اذنِ عام تھا۔ اس وقت علامہ صاحبؒ میاں

شاہنواز کی کار میں ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ہم جا کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی سی دیر کے بعد علامہ صاحب تشریف لائے اور نہایت ہی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے، حالانکہ اس سے پہلے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ میاں شاہنواز میرے پرانے دوست ہیں۔ یہ آج بیمار تھے اور میرے پاس چلے آئے۔ مَیں نے انہیں زحمت سے بچانے کے لیے یہ زیادہ مناسب سمجھا کہ خود ہی ان کی کار میں جا بیٹھوں اور پرسشِ احوال کروں۔ پھر علامہ صاحب نے لطیفے کے انداز میں یہ بات سنائی کہ شاہنواز صاحب کہہ رہے تھے کہ آؤ اکٹھے حج کے لیے چلیں۔ مَیں نے کہا: "اکٹھے کیے ہوئے گناہ اکٹھے بخشوائیں"۔ اس کے بعد علامہ صاحب مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ ایک بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ وہ ہر عنوان پر کامل اعتماد سے بات کرتے تھے۔

۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیانی عرصے میں مَیں سرگودھا کا سیشن اینڈ ڈسٹرکٹ جج رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوائے وقت روزنامے کے بجائے ایک ہفتہ وار جریدہ تھا۔ مَیں نے اس رسالے کو فرضی نام سے مزاحیہ اشعار بھیجنا شروع کیے جنہیں حمید نظامی صاحب نے بے حد پسند کیا۔ انہی دنوں مجھے حمید نظامی صاحب نے لکھا کہ مَیں اقبال کی اسرارِ خودی کو اردو شعر میں منتقل کر دوں۔ مَیں نے اس عظیم کام کے لیے اپنے آپ کو نااہل پاتے ہوئے معذرت کی، لیکن نظامی صاحب کا اصرار بڑھتا گیا اور مَیں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ مَیں شروع میں چند اشعار اردو قالب میں ڈھالتا ہوں، اگر اصحابِ فکر و نظر نے میری کوشش کو پسند کیا، تو مَیں اس سلسلے کو جاری رکھوں گا۔ چنانچہ بالاقساط ترجمہ شائع ہوتا رہا۔ عدیم الفرصتی کے باعث مَیں اس ترجمے پر نظرِ ثانی نہ کر سکا۔ ایک دن ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ وہ ترجمہ کتاب کی شکل میں چھپوایا جائے۔ چنانچہ ان کے تعاون سے ترجمہ پر نظرِ ثانی کی گئی اور ڈاکٹر صاحب ہی نے اپنے طور پر مکتبۂ کارواں سے بات کر لی اور اس طرح ۱۹۵۲ء میں "اسرارِ خودی" کا اردو شعروں میں ترجمہ "ترجمانِ اسرار" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔

مَیں نے اقبال کے بارے میں ایک اور سوال کیا:

"بعض لوگوں کی اقبال کے متعلق یہ رائے ہے کہ وہ شاعرِ انسانیت نہیں تھے بلکہ ان کا پیغام صرف ایک ملّت تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ آپ کی اس ضمن میں کیا رائے ہے؟"

رحمٰن صاحب نے پُر اعتماد آواز میں فرمایا:

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اقبال کا پیغام آفاقی نہ تھا۔ مَیں ان کے کلام میں شیکسپیئر، گوئٹے اور کانٹ کی سی عمومیت اور آفاقیت پاتا ہوں۔ دراصل ایک مفکر زندگی، کائنات اور تخلیقِ کائنات کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے اور پھر اسی زاویۂ نگاہ سے پوری زندگی کے لیے ایک عملی نظام کے تار و پود تیار کرتا ہے۔ اقبال پورے خلوص اور یقینِ کمال کے ساتھ یہ محسوس کرتے تھے کہ انسانیت کے لیے وہی نظامِ فکر و عمل درست ہے جو دینِ اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کی تکمیل اور نشو و نما صرف اس طرح ممکن ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کو انسانیت کی تعمیرِ نو کے لیے تیار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ملّتِ اسلامیہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور اسے انسانیت کی قیادت اور امامت کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اسلام زمان و مکان اور رنگ و نسل کی قیود سے ماورا ہے اور وہ تمام تر ایک بین الاقوامی اور آفاقی تحریک ہے، اس لیے اقبال کا پیام کلیتہً انسانی، عمومی اور ابدی ہے۔

میرا اگلا سوال یہ تھا:

"آپ کے نزدیک اقبال اسلامی ثقافت کا کیا تصوّر رکھتے تھے اور آپ اس نظریے سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟"

رحمٰن صاحب نے ایک لمحے کے توقف کے بعد فرمایا:

میرے خیال میں اقبال قرآن کو اسلامی ثقافت کا منبع و سرچشمہ تصوّر کرتے تھے۔ دراصل

ثقافت نام ہے فکر و عمل کے ان اصولوں کا جو ایک قوم زندگی کے مختلف شعبوں میں اختیار کرتی ہے اور یہ بنیادی اصول قرآن حکیم میں بیان فرما دیے گئے ہیں۔ اقبال کا نظریہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں یہ تھا کہ اگر ان سے انسانی خودی اور انا کو جِلا ملتی ہے تو وہ ہماری ثقافت کا ایک مفید حصّہ ہیں، ورنہ ان سے ہمیں احتراز کرنا چاہیے۔ علامہ صاحب فن اور سارٹ کے اتنے مخالف نہیں تھے جتنا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب مرقع چغتائی منصئہ شہود پر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ ایک نہایت ہی حوصلہ افزا پیشکش ہے اور ابھی ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ فن کار اسلامی آرٹ کے اور کیسے کیسے نمونے پیش کرتا ہے۔ تاہم وہ مغربی ثقافت کی بعض بے اعتدالیوں کو ہمارے سماجی ماحول اور اسلام کے تقاضوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ تھیئٹر کے کرداروں کو بھی ناپسند کرتے تھے، کیونکہ اس طرح ایک فرد کی اپنی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ رقص و موسیقی کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، لیکن ہم اقبال کے ان ثقافتی نظریات سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ لوگوں نے اقبال کے بارے میں جو یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ان کا ہر نظریہ سو فی صدی مبنی بر حق ہے، درست نہیں۔ مثال کے طور پر میں تھیئٹر میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا اور اسی طرح اگر ایک فن کار شہوانی جذبات کو برانگیختہ کیے بغیر فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

مَیں نے فن کے متعلق سوال کیا:

"رحمٰن صاحب، آپ جس فن کا ذکر فرما رہے ہیں، کیا اس کا وجود پاکستانی معاشرے میں ممکن ہے؟ جس کے بیشتر افراد "نظر" کی وہ پاکیزگی اور بالیدگی نہیں رکھتے جو شہوانیت سے بالا ہو کر صرف فن اور آرٹ کے حسن میں محو ہو جائے؟"

رحمٰن صاحب ایک منٹ کے لیے سوچنے لگے۔ آپ نے فرمایا:

"واقعی ہمارے ملک میں ابھی احتیاط کی ضرورت ہے، تاہم مَیں ان لوگوں سے اختلاف رکھتا

ہوں جو عورت کو گھروں میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس کیا قرآنی جواز موجود ہے۔ قرآن میں برقعے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ ہماری دیہاتی عورتیں اس برقعے کو استعمال نہیں کر سکتیں۔ عورت کو بھی زندگی کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مردوں کو۔ عہدِ رسالت میں بھی خواتین مختلف سماجی اور ہنگامی سرگرمیوں میں حصّہ لیتی رہیں۔ عورت کو بہت زیادہ پردوں میں رکھنے سے دو بڑی نفسی بیماریاں جنم لیتی ہیں:

(۱) جنسی احساس کو زیادہ دبانے سے عدم توازن اور شدید قسم کا کھچاؤ پیدا ہوتا ہے۔

(۲) جس چیز کو آپ پردوں میں رکھتے ہیں، اس کے بارے میں جذبۂ تجسس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں عورتیں کھلے منہ پھرتی ہیں، وہاں تانکنے جھانکنے، گھورنے اور آوازے کسنے کے واقعات بہت ہی کم پیش آتے ہیں۔"

مَیں نے اس اہم بات کی مزید وضاحت چاہتے ہوئے استفسار کیا:

"ڈاکٹر صاحب، کیا آپ کے خیال میں متقابل صنفوں کا آزادانہ اختلاط، عورتوں کے چست لہر بھڑکیلے لباس دونوں طرف سے حسن و آرائش کا بڑھتا ہوا میلان جنسی آوارگی پھیلانے میں ایک بہت بڑا کردار ادا نہیں کر رہے ہیں؟"

ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب نے نہایت محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

"مَیں مردوں اور عورتوں کے سماجی اختلاط کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتا، تاہم اس معاملے میں بھی ہمیں افراط و تفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ علمی مجالس اور ادبی محفلوں میں عورتیں بھی باوقار اور متین انداز میں شریک ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح فن اور آرٹ کے سنجیدہ مظاہروں میں بھی حصّہ لیا جا سکتا ہے۔ البتہ بال روم ڈانس کا مَیں شدید مخالف ہوں۔ یہ ناچ ہماری سماجی آب و ہوا سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتا، تاہم ایسا رقص و سرود جس میں فطری جذبات نہایت بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ ابھر کر دوسروں کے لیے روح اور نظر

کے نشاط کا سامان بن جاتے ہوں اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثال کے طور پر ہم بھنگڑا، لوک ناچ، خٹک ڈانس کو رواج دے سکتے ہیں، کیونکہ ان کا ہماری ثقافتی اور سماجی زندگی سے گہرا اور فطری تعلق ہے۔ ہمیں مغربی تہذیب و ثقافت کی نقالی میں اپنی شخصیت یا ثقافت کو ختم نہیں کرنا چاہیے۔ مردوں اور عورتوں کے لباس صاف ستھرے تو ہونے چاہییں لیکن اتنے چست اور بھڑکیلے نہ ہوں کہ ذہنی آوارگی اور جنسی پیاس کو بھڑکانے کا ذریعہ بن جائیں۔"

موضوع کو بدلتے ہوئے میں نے سوال کیا:

"آپ کے نزدیک ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ خطرناک رجحان کون سا ابھر رہا ہے اور اس کی روک تھام کیونکر ممکن ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"یوں تو معاشرے میں بہت سے تشویش کن رجحانات ابھر رہے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک رجحان زندگی کے معیار کو مصنوعی طور پر زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کا ہے۔ اب ہر شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ اسے زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور عشرتیں حاصل ہو جائیں۔ اس رجحان کو جنم دینے والے ایک سے زیادہ اسباب ہیں۔ معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے طبقاتی کشمکش پیدا کر دی ہے اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جس تیز رفتاری سے معاشرے میں "نو دولتیے" پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اسراف اور ظاہری نمائش کے اوچھے طریقوں سے پورے معاشرے کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے۔ روحانی اور اخلاقی اقدار کے بجائے اب زیادہ تر لوگ دولت کو زندگی کا واحد نصب العین تصوّر کرتے ہیں۔ اس غلط رجحان کو ختم کرنے کے لیے صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی اصلاح کرے اور دوسرے کے لیے اچھا نمونہ پیش کرے۔ اگر ایک دفعہ ذہنی تحریک کا آغاز ہو گیا تو اس کی لہریں پورے معاشرے میں تموج پیدا کر دیں گی۔ دوسرا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے اونچے طبقے سادگی اختیار کریں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ

کفایت شعاری اور سادہ زندگی انھیں فی الواقع عزیز ہے۔ اس سے معاشرے پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔ اس ضمن میں پریس اور علماء انقلابی رول ادا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو عوام کے رگ و پے میں سادگی کی روح سرایت کر سکتے ہیں۔

اور میری آخری سوال یہ تھا:

"آج کل رسم الخط کی جو بحث چل نکلی ہے اس کے متعلق آپ کے احساسات کیا ہیں؟"

آپ نے فرمایا:

پاکستان میں رسم الخط کا مسئلہ سنگین بنتا جا رہا ہے مَیں اس کے بارے میں یہ قطعی رائے رکھتا ہوں کہ ہمیں خط نسخ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے علوم و فنون کا پورا ذخیرہ اسی خط میں موجود ہے۔ اس رسم الخط سے ہماری تہذیبی روایات اور ثقافتی اقدار وابستہ ہیں۔ پھر یہ کہ ہر مسلمان کا بچّہ قرآن پڑھتا ہے اور اس طرح وہ شروع ہی سے اس خط سے ذہنی وابستگی حاصل کر لیتا ہے۔ اب رومن رسم الخط اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اسلاف کی تمام تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں ترکی کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ وہاں صرف دو سَو پرانی کتابوں کو نئے رسم الخط میں منتقل کیا جا سکا ہے اور وہ قوم اپنے اسلاف کے علمی اور تہذیبی ورثے سے کلیتہً محروم ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنے اصوات کو رومن رسم الخط میں ادا کرنے کے لیے خود رومن رسم الخط میں نئی نئی علامات کا اضافہ کرنا ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح جو نیا رسم الخط وجود میں آئے گا، وہ ان کے لیے بھی بڑی حد تک اجنبی ہو گا جو انگریزی زبان لکھ پڑھ لیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رسم الخط اختیار کرنے پر زور اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ہم مغربی علوم و فنون کو بآسانی اپنی زبان میں منتقل کر سکیں گے۔ لیکن پورے ملک میں ان لوگوں کی تعداد کتنی ہو گی جنھیں مغربی علوم حاصل کرنے کی ضرورت پڑے گی؟ آخر چند فیصدی لوگوں کے لیے نئے تجربے کو آزمانا کس حد تک درست ہے؟ غالباً جو لوگ رومن رسم الخط کے حامی ہیں وہ اس کے ذریعے مغربی

اور مشرقی پاکستان کے مابین رسم الخط کی یگانگت اور وحدت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وحدت و یگانگت کے نقطۂ نظر سے بھی نسخ رسم الخط زیادہ موزوں ہے۔ مسلمان ہونے کی بناء پر مشرقی پاکستان کے باشندے بھی خط نسخ سے روحانی اور دینی وابستگی رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا کہ خود بنگال میں تحریک "حروفِ قرآن" اس مقصد کے لیے کام کرتی رہی کہ بنگالی لٹریچر کو عربی رسم الخط میں منتقل کیا جائے، چنانچہ اس تحریک نے ایک اچھا خاصا لٹریچر منتقل بھی کیا، لیکن بعد میں کلکتہ سے آیا ہوا اثر و نفوذ اس تحریک پر غالب آ گیا اور تحریک ختم ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ قوی دینی حس اور شعور رکھتے ہیں اور اگر ان کی دینی حس کو بیدار اور مستحکم کیا جائے تو وہ بآسانی خط نسخ کو اختیار کر سکتے ہیں۔ مگر یہ سارا کام تدریجی اور حکیمانہ انداز میں ہونا چاہیے۔"

انٹرویو دو گھنٹوں پر پھیل گیا تھا، مگر اس تمام عرصے میں گاہے مسکراہٹیں اور گاہے قہقہے فضا میں تیرتے رہے اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میٹھے میٹھے بولوں کی نرم رو ندی دھیرے دھیرے بہہ رہی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد صاحب کی تحریروں کو پڑھنے اور ان کی تقریروں کو سننے کے بے شمار مواقع میسّر آئے۔ ان کے سنجیدہ خیالات جنہیں وہ چُچے تُلے اور رواں رواں الفاظ و تراکیب میں ڈھال کر کسی محبوب کے پیکر کے خطوط کی طرح حسین اور حیات آفرین بنا دیتے ہیں، وہ ہمیشہ مجھے اپنی طرف کھینچتے رہے، لیکن ان کی شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر اس وقت کیا جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں رومن رسم الخط کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ ان کے اس مفہوم کے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں:۔

"رومن رسم الخط اختیار کرنا قومی خودکشی کے مترادف ہوگا اور ہم جیتے جی یہ خودکشی نہیں ہونے دیں گے۔"

اس تاثر نے مجھ میں مولانا سے انٹرویو لینے کی خواہش پیدا کی، لیکن اِدھر مَیں مصروف اور ــــ اُدھر وہ ــــ بالآخر ہفتوں کی تگ و دَو کے بعد دو ملاقاتوں میں مولانا سے فکر و نظر کے انمول موتی حاصل کرنے میں کامیاب

ہو گیا اور ایک ایسا پاکیزہ جذبہ لے کر اٹھا جسے میں اب اپنی زندگی کی متاعِ گراں مایہ سمجھنے لگا ہوں۔

انگریزی لباس میں ملبوس مولانا انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ حقارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ انگریزوں کی سطوت کے خلاف نبرد آزما ہوتے گزارا اور آج وہ پاکستان میں بڑھتی ہوئی انگریزیت کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں۔

وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہر وقت مضطرب رہتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان جس درندگی اور بہیمیت کے شکار ہیں، ان پر وہ خون کے آنسو بہاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے تحفّظ اور بقا کا کوئی راستہ نکل آئے۔ جرأت و بے باکی نے دردمندی کے احساسات کو اور زیادہ شدّت دے دی ہے۔

وہ بلا کے محنتی ہیں، ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ اتنا کام کرتے ہیں کہ اس کا تصوّر بھی ہمارے نوجوان نہیں کر سکتے۔ صبح چار بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک وہ وقت کی راہگزر پر مسلسل محنت کے نقوش ثبت کرتے رہتے ہیں ۔ شاید یہ نقوش ہماری نوخیز نسل کے لیے چراغِ راہ بن سکیں۔ اپنے کام میں ان کے انہماک کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی محبوب بیوی کی موت پر بھی آدھ دن سے زیادہ کا وقت نہ نکال سکے۔ سوچتا ہوں قوم سہل انگاری کا شکار ہوتی جا رہی ہے، کاش! وہ محسوس کرے کہ صحیح عظمت اور سچا وقار محنت و ریاضت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

مولانا اردو ادب کے کتنے کہنہ مشق نثر نگار ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ معرکۃ الآراء صدارتی خطبے چند گھنٹوں میں ٹانگوں، بسوں میں سفر کرتے ہوئے تیار کر لیتے ہیں۔ انہیں کوئی موضوع دے دیجئے، وہ قلم برداشتہ لکھیں گے اور چند منٹوں میں مضمون تیار ہو جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ ساتھ ساتھ ملاقاتیوں سے مصروفِ گفتگو بھی رہتے ہیں۔ مولانا کا لب و لہجہ ان کی عظمتِ افکار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ مطالب کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ ٹھہرا ٹھہرا اور پر متانت لہجہ، لفظوں میں بلا کا وقار اور سحر پیدا کر دیتا ہے یعنی جیسی ان کی تحریر مرصع ہوتی ہے اسی مناسبت سے ان کا لہجہ مسجع ہوتا ہے۔ کون ہے

جو اس دو آتشہ شراب کو پی کر بیخود نہیں ہو جاتا؟

مولانا ان لوگوں میں سے ہیں جو دولت سے زیادہ مقصد اور نصب العین کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ عشق میں کچھ حاصل کرنا نہیں ہوتا، سب کچھ لُٹا دینا ہوتا ہے۔ آہ! اب وہ لوگ کتنے ہیں جو عشق کے اس مفہوم سے آگاہ ہیں۔

س : آپ کی ابتدائی زندگی کے کوائف درکار ہیں۔

ج : مَیں ۱۹۰۲ء میں بمقام لاہور پیدا ہُوا۔ میرے والد بزرگوار چیفس کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ مَیں ابھی چار پانچ سال ہی کا تھا کہ میرے والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میرے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد نے جو مجھ سے عمر میں بیس بائیس سال بڑے تھے، میری پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داری لی اور اسے نہایت احسن طریق پر نبھایا۔ برادرِ مکرّم محکمۂ پولیس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، لیکن یہ ملازمت ان کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ جب ۱۹۳۵ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ساری زندگی اس بات کا افسوس کرتے رہے کہ ان کی توتیں اور صلاحیتیں غلط راہ میں صرف ہوئیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایس سی کالج بہاولپور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ایک مدت تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔

س : مولانا، آپ نے اپنے گھر کے ماحول کے متعلق تو کچھ بتایا ہی نہیں۔

ج : گھر کے ماحول کا تعلق والدین سے ہُوا کرتا ہے۔ والد صاحب کے متعلق مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ اسی طرح والدہ صاحبہ بھی دینی حس اور قومی جذبے سے سرشار تھیں۔ گھر میں سادگی، شفقت، ایثار اور قربانی کا ماحول کارفرما تھا۔ والدہ صاحبہ کی زبانی والد صاحب کے سیرت و کردار کے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہُوا، لیکن وہ باتیں ایسی ہیں جن کا اگر مَیں خود ذکر کروں

تو وہ شاید خود ستائی یا خاندان ستائی پر محمول کی جائیں۔

س : مولانا! اگر ان باتوں کے بتانے سے آپ کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور آپ کے والد صاحب کی سیرت و کردار ہمارے لیے کوئی اچھا نمونہ پیش کرتی ہے تو میری رائے ہیں آپ کو ان باتوں کا ضرور ذکر کرنا چاہیے۔

ج : قریشی صاحب! آپ نے بات ہی کچھ اس طرح کی کر دی ہے کہ میرے لیے کچھ کہے بغیر چارہ نہیں۔ والدہ صاحبہ کی زبانی مَیں نے جو کچھ سُنا اس سے والد صاحب کے متعلق یہ اندازہ ہُوا کہ وہ اپنے سینے میں قومی خدمت اور ایثار کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ والدہ صاحبہ نے بتایا کہ یہ انیسویں صدی کے آخری ربع کی بات ہے۔ سر سید اور حالیؔ مرحوم پنجاب میں تعلیم کے فروغ کے لیے لاہور آئے۔ اندرونِ شہر مسلمانوں کا ایک شاندار جلسہ ہُوا اور سر سیّد نے زندہ دلانِ لاہور سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کی توسیع کے کام میں ان سے مالی تعاون کریں۔ سر سیّد کی اس اپیل کو سُن کر تمہارے والد صاحب میرے پاس آئے۔ وہ ان دنوں نارمل سکول میں استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سر سیّد کی اپیل کا ذکر کیا اور کہا کہ جو کچھ مَیں نے پس انداخت کیا ہُوا ہے، لے آؤں۔ ان دنوں ہمارے گھر میں ایک بڑا سا پتیلا ہُوا کرتا تھا جس میں ہمیں جو کچھ بچتا، جمع کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں چاندی کے روپے چلتے تھے۔ اس طرح یہ پتیلا ہمارے لیے محفوظ پیٹی (سیف) کی حیثیت رکھتا تھا۔ تمہارے والد کے کہنے پر مَیں نے اس پتیلے کی طرف اشارہ کیا کہ ساری زندگی کی پونجی اسی میں ہے۔ انہوں نے جمع شدہ روپے گنے، وہ پانچ سَو کے لگ بھگ تھے۔ وہ یہ سب کچھ اٹھا کر لے گئے اور سر سیّد کے سامنے ڈھیر کر دئے۔ سر سیّد نے اس جذبۂ ایثار سے متاثر ہو کر کہا کہ جب تک میری قوم میں ایسے افراد موجود ہیں، مجھے کبھی مایوسی نہیں چھو سکتی۔ حالیؔ نے اس واقعے کا تذکرہ "حیاتِ جاوید" میں کیا ہے۔

والدہ صاحبہ بھی اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب طرابلس کی جنگ شروع ہوئی اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کے لیے ہندوستان میں چندہ جمع کرنے کی تحریکیں اٹھیں تو والدہ صاحبہ نے اپنا سب کچھ (جس میں زیور بھی شامل تھا) چندے میں دے دیا۔ ان واقعات نے میرے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے ۔۔ ایسے اثرات جنہوں نے زندگی کا رخ کسی اور طرف ہی پھیر دیا۔ اپنے والدین کی قومی معاملات میں یہ گہری دلچسپی اور لگاؤ میرے لیے مشعلِ راہ بنا اور میں نے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا اس وقت فیصلہ کر لیا، جب ابھی میرا شعور کچھ زیادہ پختہ نہیں ہوا تھا۔

س : آپ نے تعلیمی مراحل کس طرح طے کیے ؟

ج : میری تعلیمی زندگی میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، البتہ ایک دو باتوں کا ذکر غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ابھی میں تعلیم کے ابتدائی مدارج ہی میں تھا کہ طرابلس کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو بڑی بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا اور مسلمان نہایت ہی مظلومیت اور بے بسی کے عالم میں تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب اور سرحد میں ان مسلمانوں کی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کی تحریک چلائی۔ میں ابھی نوعمر تھا۔ مولانا جلسے جلوسوں میں مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرتے تھے۔ میں گھروں میں جا جا کر چندہ جمع کرتا تھا۔ اس تحریک کے بعد میں نے اپنا تعلیمی سفر دوبارہ جاری کیا۔ ایف۔ اے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے کیا اور میں ابھی تھرڈ ایر میں تھا کہ برِصغیر پاک و ہند میں ایک اور سیاسی تحریک اٹھی جس نے میری تعلیمی زندگی میں ایک اور انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ ترکِ موالات کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر ہم نے کالج کو خیرباد کہا۔ انہی دنوں اس تحریک کے زیرِ اہتمام ہندوستان میں قومی یونیورسٹی قائم ہوئی جس کی ایک شاخ بریڈلاہال میں قائم ہوئی میں نے اسی یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس یونیورسٹی سے ڈگریاں لینے والوں میں اور بھی کئی اشخاص شامل تھے۔ جناب

حامد علی خاں جو آج کل فرینکلن میں کام کر رہے ہیں، اسی یونیورسٹی کے سند یافتہ ہیں لیکن انہیں بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے بھی بی اے کا امتحان پاس کرنا پڑا۔

س : مولانا، آپ کو مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ کام کرنے کا مدتوں موقع ملا ہے۔ آپ ان کے متعلق کیا تاثرات رکھتے ہیں ؟

ج : جی ہاں، میں نے ان کے ساتھ برسوں کام کیا۔ وہ دراصل ہمارے "گرو" تھے اور اس لیے میں نے ان کی زندگی کا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا۔ میرا تعلق نیازمندی اور اطاعت کیشی کا تھا اور میرے نزدیک اطاعت کیشی میں "کیوں ؟" اور "کیوں نہیں ؟" کے الفاظ قطعاً ناجائز ہیں۔ میری نگاہوں نے ان کی شخصیت میں عظمت و رفعت کے اُبھرتے ہوئے نہایت ہی دلآویز خطوط دیکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ تاثر تمام تر جذبات کی پیداوار نہیں بلکہ اس میں تاریخی واقعیت بھی سمٹ کر آگئی ہے۔ مولانا نے انگریزی تسلط اور استبدادیت کے خلاف اس وقت آواز بلند کی جب بڑے بڑے آئمہ سیاست "اس در" کی جبہ سائی کو عین کمالِ ایمان سمجھتے تھے۔ پنجاب اور سرحد میں انگریزی اقتدار کی جڑیں اکھیڑ دینے والوں میں سرِ فہرست یہی مولانا تھے۔ ان کی تقریر اور تحریر میں وہ شعلے پنہاں تھے جنہوں نے بے حس انسانوں کے سرد خانوں میں بھی نا بجھنے والی آگ سلگا دی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ مسلمانوں میں بالخصوص پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں میں انگریزی استعماریت کے خلاف بے پناہ نفرت پیدا کرنے والوں میں کوئی بھی مولانا کے برابر نہیں پہنچتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کے ہاں جذباتیت زیادہ تھی اور غور و فکر کم۔ وہ "ناپ تول" کر قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ اس تاثر میں حقیقت کا ایک بڑا عنصر موجود ہے۔ دراصل وہ عہد ہی جذبات میں ہلچل مچا دینے کا تھا۔ اس کے بغیر انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی کا جوش، ولولہ اور ہمت پیدا ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر ان حالات میں زیادہ وقت سوچ بچار میں گزار دیا جاتا اور ہر قدم اٹھانے سے

پہلے اسے نفع ونقصان کی میزان پر تولا جاتا تو شاید ہمیں ایک صدی اور غلامی سے نجات نہ ملتی۔ کیا تحریکِ پاکستان خود ایک جذبے کی پیداوار نہیں تھی؟ ہندوؤں نے ہمیشہ پاکستان کے مطالبے کے جواب میں ہمارے سامنے اقتصادی، معاشی اور جغرافیائی نقصانات و ناممکنات کا ایک لمبا چوڑا دفتر کھول کر رکھا لیکن ہم نے ایک ہی جذبے کے زیرِاثر ان تمام پیمانوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

س : مولانا، آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کب سے کیا؟

ج : ادب وصحافت کے ساتھ مجھے طالب علمی کے زمانے ہی سے دل چسپی تھی، چنانچہ مَیں نے کالج کی زندگی کے آغاز ہی میں ایک رسالہ "نخلستان" کے نام سے نکالا۔ یہ بہت جلد اچھا خاصا مقبول ہو گیا۔ اس میں علامہ اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خاں جیسے اساتذہ کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اس وقت کے ممتاز نثر نگاروں نے اس میں دلچسپی لی، لیکن یہ رسالہ ہمارے ہنگامہ خیز مزاج کے باعث زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ تاہم اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مَیں اس رسالے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے تعلیمی مصروفیات کے بعد مختلف ہفتہ واروں اور روزناموں میں کام کرتا۔ اس طرح جہاں صحافت کے میدان میں میرے تجربات میں وسعت پیدا ہوئی، وہاں دل میں اس کے لیے شوق بھی بڑھتا گیا۔

مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ۱۹۳۵ء سے مَیں "ادبی دنیا" کے مالک اور مدیر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں مختلف موضوعات پر ہزارہا صفحات سپردِ قلم کیے، لیکن آج جب ان کا تنقیدی جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب کچھ مجھ سے لکھوایا گیا ہے، مَیں نے ایک سطر بھی اپنے ذہن و دماغ کی یک سُوئی اور آمادگی کے ساتھ نہیں لکھی۔ ایک تنکے کی طرح سطحِ آب پر تھپیڑوں کے زیر و بم کے ساتھ تیرتا رہا معلوم نہیں کیوں؟

س: اکادمی پنجاب کا قیام کب عمل میں آیا اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟

ج: یہ اکادمی ۱۹۵۴ء میں ایک وقف کے ساتھ قائم ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا مقصد سنجیدہ کتابیں شائع کرنا ہے اور انہیں کم قیمت پر فروخت کرنا ہے۔ ہمارے خیال میں سنجیدہ ادب کی اشاعت و ترویج سے ذہین طبقوں اور دانشوروں میں علمی اور فکری تحریک چل نکلے گی جس کے نتیجے میں ایک سنجیدہ ذہن جنم لے گا۔ اس کام کے علاوہ میں نے ایسے نوجوان بھی تیار کر رہا ہوں جو میرے بعد اس اکادمی کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں اور اس مالی ایثار کے لیے تیار ہوں جس کا اکادمی تقاضا کرتی رہے گی۔ خدا کے فضل سے مجھے کچھ ایسے نوجوان میسر آگئے ہیں اور یہ واقعی معجزے سے کم نہیں کہ اس زر پرست ماحول میں ابھی ایسے نوجوان موجود ہیں جو اعلیٰ مقصد کے لیے ایثار کرنا جانتے ہیں۔

س: مولانا، ایک ادیب پر معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

ج: ادیب پر ذمہ داریاں عائد کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ادیب کون ہوتا ہے۔ ایک فن کار جو کچھ دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے اسے قوتِ اظہار کے ذریعے بے ساختہ بیان کر دیتا ہے۔ ایک فن کار میں قوتِ احساس جتنی زیادہ شدید ہو گی اتنی ہی شدت اور تاثیر اس کے فن میں ہو گی، لیکن احساس کا یہ جذبہ بالکل ہی فطری اور ذاتی ملکہ ہے۔ ہر فن کار اپنی اپنی استعداد ظرف اور ذہنی ساخت کے مطابق سوچے گا۔ اب ایک فن کار پر یہ قید لگا دینا کہ وہ فلاں جذبے کو اپنے اندر ابھرنے دے اور فلاں جذبے کو سرحدِ احساس میں داخل نہ ہونے دے، میرے نزدیک سر تا سر غلط اور ناجائز ہے۔ جذبہ ایک خود رَو پودے کی مانند ہے جسے اپنی نشو و نما کے لیے خارجی اثرات کی حاجت نہیں۔ یہ دل کی دنیا کسی پابندی کی متحمل نہیں۔ جب صورتِ حال یوں ہے تو پھر ادیب پر کسی نوع کی ذمہ داریاں عائد کر دینا کیسے درست قرار پا سکتا ہے۔

س: مولانا، آپ علم و ادب کے میدان میں کن کن اہلِ قلم سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں؟"

ج : مجھے شمس العلماء محمد حسین آزاد، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ابوالکلام آزاد کی تحریریں ایک جادو تھا، ایک سحر تھا جو مجھے بے خود بناتا چلا گیا اور محمد حسین آزاد کی نثر میں شعر کی سی روانی، نغمگی اور رنگینی تھی جس نے ذہن و فکر میں سرور و نشاط کا رس گھول دیا۔

س : پاکستان میں اردو کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے ؟

ج : پاکستان میں اردو کا مستقبل شاندار بن سکتا ہے، اگر ہم اسے اپنی زبان سمجھنے لگیں۔ علاقائی زبانوں کی عصبیت کا طوفان جو مختلف منبعوں سے پھوٹ رہا ہے، وہ اردو کے لیے نہایت ہی ضرر رساں ہے۔ کچھ لوگ پنجابی زبان کو اردو کے مقابلے میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی یہ کوششیں قطعاً قابلِ قدر نہیں ہیں۔ مَیں خود پنجاب میں پلا، اس سرزمین کے چپّے چپّے سے مجھے بے پناہ محبت ہے، لیکن مَیں پنجابی زبان کو قطعاً اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ اسے اردو کی جگہ دی جائے۔ پنجابی زبان دراصل اردو زبان ہی کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل ہے۔ اب اسے نادانی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ ترقی یافتہ شکل کے ہوتے ہوئے ہم غیر ترقی یافتہ شکل کو اختیار کرنے کے لیے سعی کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں اتنی بات اور کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں اردو زبان میں اور زیادہ لچک اور وسعت پیدا کرنا ہو گی۔ ہم لکھنؤ اور دہلی کے ماحول میں پرورش پائی ہوئی زبان میں وہ الفاظ و محاورات اور احساسات کیوں نہ منتقل کریں جو پنجاب کی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ جب اردو زبان کے پھلنے پھولنے کے لیے صرف مغربی پاکستان ہی کا علاقہ رہ گیا ہے تو کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اس زبان کو اس علاقے کی خصوصیات، امنگوں اور روایات سے ہم آہنگ کریں۔ اس طرح اردو زبان زیادہ آسانی سے یہاں کے عوام کی زبان بن جائے گی۔

س : اردو زبان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں غیر سرکاری طور پر کیا کچھ کیا جا سکتا ہے ؟

ج : سب سے زیادہ مؤثر کام یہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس بات پر سختی سے عمل کریں کہ اپنی روزمرہ کی

بات چیت صرف اردو زبان میں کریں۔ ہم خواہ مخواہ اور بلا ضرورت جو انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس سے اجتناب کریں۔ دفتروں، نجی اداروں، بنکوں اور دوسرے عوامی اجتماع گاہوں میں ہم صرف اردو کو اظہار و بیان کا ذریعہ بنائیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ باگ انگریزی بول کر اپنی علمیت کا رعب جمانا چاہتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیں یہ جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ جو شخص انگریزی میں بات کرے (حالانکہ وہ اردو میں بات کر سکتا ہے) تو اس کی بات کا جواب نہ دیا جائے یا کم از کم اس تاثر کا اظہار کیا جائے کہ آپ نے اس کی انگریزی کو پسند نہیں کیا ہے۔ اس قسم کے سخت رویّے کے بغیر کوئی خوش گوار تبدیلی ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ہم اس بات کا بھی پورا پورا التزام کریں کہ خط و کتابت اردو میں کی جائے۔ ہمارے لکھنے کے پیڈ اردو میں چھپے ہوئے ہوں اور ہماری دکانوں کے سائن بورڈ اردو میں لکھے ہوئے ہوں۔ یہ کام ایسے ہیں کہ ایک پیسہ خرچ کیے بغیر کیے جا سکتے ہیں۔

س : مولانا، کیا وجہ ہے کہ اردو زبان میں معیاری ڈرامے بہت ہی کم ہیں؟

ج : ڈرامے اس ادب اور سوسائٹی میں زیادہ تر رواج پاتے ہیں جہاں عورت تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہو اور جہاں مرد اور عورت کا آزاد اختلاط ہو۔ چونکہ اردو زبان زیادہ تر مسلمانوں کی ثقافتی رجحانات اور روایات کی آئینہ دار ہے، اس لیے اس زبان میں عورت کو مرکزی حیثیت نہیں ملی۔ یہاں تو یہ بھی گوارا نہ کیا گیا کہ محبوب کا عورت ہونا ظاہر کیا جائے۔ اس وجہ سے اردو ادب میں ڈرامہ نگاری زیادہ ترقی نہ کر سکی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابلِ غور ہے۔ دراصل مسلمان اپنی زندگیوں میں ڈراما پیدا کیا کرتے ہیں، وہ خوابوں اور خیالات کی دنیا میں ڈرامے نہیں دیکھا کرتے۔ محمود غزنوی نے سترہ سالوں میں سترہ حملے کر کے تاریخ کا سب سے اہم ڈراما تخلیق کیا۔ بختیار خلجی نے صرف اٹھارہ آدمیوں کی مدد سے بنگال اور بہار کی سرزمین میں ناقابلِ فراموش ڈراما تاریخ کی سٹیج پر کھیلا۔ میرے نزدیک اردو ادب میں ڈرامے کی کمی کے یہی دو بڑے سبب ہیں۔

س : پاکستانی معاشرے کے رُو بہ تنزّل ہونے کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟

ج : پاکستانی معاشرہ بڑی تیزی سے رُو بہ تنزل ہے۔ میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب غیر مسلموں کی متروکہ املاک ہے۔ ان املاک نے ہمیں زبردستی مادی منافعت کے ایسے گرداب میں دھکیل دیا ہے جس سے نجات کا راستہ نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں نے روپے پیسے کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسلام نے انہیں سادگی، اصول پسندی اور اخلاقی پاکیزگی کی تعلیم دی تھی، لیکن متروکہ املاک نے جہاں ہم میں بہت سی اخلاقی بیماریاں پیدا کیں وہاں مستقلاً ہمارے ذہن کو بدل ڈالا۔ اب ہماری زندگی کا مطمعِ نظر ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت جمع کرنا بن کر رہ گیا ہے۔ اخلاقی بندشیں ڈھیلی پڑتی چلی گئیں، ضمیر کی کسک آہستہ آہستہ ختم ہوگئی اور ہم خونخوار بھیڑیوں کی طرح بالآخر اپنوں ہی کا شکار کرنے لگے۔ ہم دولت کے پجاری معبودِ حقیقی کو بھلا بیٹھے ۔ اور پھر وہی ہوا جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

س : کیا آپ کے نزدیک "اسلام" کی بجائے صرف اسلام کی رُوح کو اپنا لینا کافی ہے؟

ج : قطعاً کافی نہیں۔ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس میں روح اور جسم کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جسم کے بغیر روح ایک غیر مرئی شے ہے جس کی موجودگی کو محسوس کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح جسم روح کے بغیر ایک بے جان لاشہ ہے۔ اسلام انسان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اسے نافذ کرے۔ اسلام کے ظواہر اتنے ہی اہم ہیں جتنے اس کے غیر فانی قوانین۔ اسلامی نظام کی تفاصیل اور جزئیات، اپنے کلیات و مبادی سے ایک منطقی اور فطری تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ میرے نزدیک تو "اسلام کی روح" کی اصطلاح ہی خود فریبی سے کم نہیں۔

س : ہندوستان کے مسلمانوں کا اب کیا مستقبل ہے؟

ج : اس مسئلے نے مجھے بے حد مضطرب کر رکھا ہے، تیرہ چودہ سال گزر جانے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات

کی لہر کا اس شدّت سے اٹھنا نہایت ہی بُرے حالات کی غمّازی کر رہا ہے۔ یہ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان اب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مجھے یوں نظر آتا ہے کہ اگر بروقت کچھ نہ کیا گیا تو ہندو، مسلمان اقلیت کو اپنے اندر جذب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو یہ اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہوگا۔ اس سلسلے میں پاکستان کی حکومت اور دانشوروں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خود ہندوستان کے مسلمان بھی بُزدلی کی موت مرنے کی بجائے زندگی کے لیے مجاہدانہ جدوجہد کر سکتے ہیں۔

س : مولانا، اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ بتائیے۔

ج : میری زندگی میں ایک موقع پر ایک ایسا موڑ آیا جس نے شاہراہِ حیات کے رخ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں مارشل لاء لگایا گیا اور اس میں ہندوستانیوں پر جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے ان کی وجہ سے میں انگریزوں سے بے حد متنفّر ہو گیا۔ یہ جذبۂ نفرت تحریکِ ترکِ موالات کی وجہ سے شدّت اختیار کر گیا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ انگریزوں کی ملازمت نہیں کروں گا۔ انہی دنوں پولیس کے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے کے لیے میری نامزدگی کے کاغذات اوپر گئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ ممتاز و معزّز خاندانوں کے تعلیم یافتہ افراد کو ضلعی حکام کی سفارش پر مختلف محکموں میں نامزد کر دیا جاتا تھا۔ میری تعیناتی کے احکامات آ گئے۔ رات کو بڑے بھائی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا:

"پوری سنجیدگی سے سوچ لو کہ اب کیا کرنا ہے۔ اگر ملازمت کر لیتے ہو تو ساری زندگی آرام سے بسر ہو گی اور اگر نہیں کرتے ہو تو زندگی کا سفر بہت کٹھن ہو جائے گا۔"

میں نے ایک لمحے کے توقّف کے بغیر اپنا فیصلہ دہرایا:

"میں انگریزوں کی ملازمت ہرگز نہیں کروں گا۔"

بھائی صاحب چونکہ خود انگریزوں کے خلاف جذبۂ حقارت رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت ملازمت کر لیتا تو آج ڈی۔ آئی۔ جی پولیس ہوتا، لیکن میرا ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ـــ مگر آج میں خوش ہوں کہ اگرچہ میری پوری زندگی محنت کرتے گزری، لیکن الحمدللہ میرا ضمیر زندہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر

اورینٹل کالج لاہور کی بالائی منزل میں جہاں گھنے درختوں کے شاداب سائے اور ماحول کی خاموشی میں تحلیل ہونے والی میٹھی میٹھی سرگوشیاں زندگی کو حسین تر بنا دیتی ہیں، ایک کشادہ کمرہ ہے جس میں اُردو زبان پر جدید انداز میں تحقیق کرنے والے ماہرین میزوں پر جُھکے نظر آتے ہیں۔ اس شعبے کے صدر جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر صاحب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں ایک کتاب اُردو میں ترتیب دی ہے جس کا نام 'محفل' رکھا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو کے اُن شعراء کا منتخب کلام جمع کیا ہے جن کو لاہور کے مشاعروں میں وہ سُن چکے ہیں۔ یہ کتاب جب میری نظر سے گزری تو مجھ میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ ایک تو اس لیے کہ وہ امریکی مسلمان ہیں، دوسرا اس لیے کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود اُردو زبان میں حد درجہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ یعنی جو کام ہم پاکستانیوں کو کرنا چاہیے تھا وہ ڈاکٹر صاحب کر رہے ہیں۔

مَیں نے فون پر ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کے لیے وقت مقرر کیا۔ وقت معیّن پر اورینٹل کالج کی سیڑھیوں پر ماضی کی حسین یادوں کے نقوش ڈھونڈتا ہُوا بالائی منزل میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی

سُرخ و سپید چہرہ، شباب کی رعنائیاں لیے ہوئے، کشادہ پیشانی جس پر زندگی کے اُتار چڑھاؤ کے غیر مرئی نقوش مرتسم تھے، بلند قامت، مسکراتی آنکھیں جیسے غُصّے کی کیفیت سے کبھی آشنا ہی نہیں ہوئیں، گفتار میں انیس کے لہجے کی نفاست، چال میں متانت اور دھیمے پن کا حسین امتزاج، گرم جوشی سے ملے، باتیں شروع ہوئیں۔ وقت بھی کچھ دیر کے لیے ہماری باتیں سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ مَیں سوچنے لگا زندہ قوموں کے افراد کی باتیں بھی کتنی حیات آفرین ہوتی ہیں۔

مَیں نے بارکر صاحب سے سب سے پہلا سوال اُن کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کیا۔ اس سوال پر وہ کچھ ایسے کھو گئے جیسے گزرے ہوئے ایام کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے وہ کسی منظر کی رعنائیوں میں گم ہو گئے ہوں۔ کہنے لگے:

"تینتیس سال پہلے کی بات ہے جب مَیں ریاست واشنگٹن میں جو بحرالکاہل کے کنارے دارالحکومت واشنگٹن سے تین ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے، ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہُوا۔ والد صاحب محکمۂ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، انہوں نے میری تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ مَیں مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علم کی پیاس بجھاتا رہا۔ ۱۹۵۱ء میں فلبرائٹ سکالرشپ پر ہندوستان آیا۔ اس خطّے میں میرے آنے کا مقصد مختلف باشندوں کی لسانی اور تہذیبی تاریخ و روایات پر تحقیق کرنا تھا۔ یہاں پانچ چھ سال گزارنے کے بعد مَیں واپس امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے کینیڈا آیا۔ یہاں مشہور مستشرق عالم سمتھ کی زیر نگرانی مختلف مذاہب پر کام کرتا رہا۔ ریڈ انڈینز پر تحقیقی کام کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم و تدریس کے مختلف مراحل پر دس بارہ زبانیں سیکھنے کے مواقع ملے۔ انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، اُردو، بلوچی، پشتو، براہوئی، سیامی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، سنسکرت اور ہندوستان کے دکنی باشندوں کی چار پانچ بولیاں سیکھیں۔ ۱۹۵۹ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کی تحریک پر پاکستان آیا تاکہ اردو زبان پر جدید انداز میں تحقیق کی جائے۔"

بارکر صاحب زندگی کے اوراق پلٹتے جا رہے تھے اور مَیں حیرت کا مجسمہ بنا کسی سوچ میں غرق تھا، کتنا محنتی ہے یہ شخص، تیس بتیس سال کی چھوٹی سی عُمر میں اس نے علم و فن کے کتنے گہر ہائے گرانمایہ اپنے دامن میں

ٹانک لیے ہیں۔ کتنے ہی سمندر پی لیے ہیں اور ابھی تشنگی باقی ہے۔ علم کا غرور مزاج کو چھو کر بھی نہیں گیا۔ علم و فن کی باتیں ہو رہی تھیں اس لیے ذہن میں امریکہ کے تعلیمی نظام کے متعلق سوالات اُبھرنے لگے۔ مَیں نے ہارکر صاحب سے پُوچھا کہ "آپ کے ملک میں تعلیم کا ڈھانچہ کیا ہے؟"

"ہمارے ملک میں نظامِ تعلیم آپ کے ملک کے نظامِ تعلیم سے کلیتہً مختلف ہے۔" یہ اُن کا مختصر جواب تھا۔ بات کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ہمارے نظامِ تعلیم کی تین چار خصوصیات ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ دن میں کام کرنے والے مزدور، کارکن، سرکاری ملازم رات کے وقت تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک میں ایسے بے شمار تعلیمی ادارے ہیں جن میں رات کی کلاسیں لگتی ہیں۔ اس تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہمارے ملک میں ایک مزدور بھی لکھنا پڑھنا جانتا ہے اور اس میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اُبھرتی رہتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم پر بھی کوئی پابندی نہیں اور ایک ایک یونیورسٹی میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ ہوتے ہیں۔ صرف کیلیفورنیا یونیورسٹی میں، جہاں مَیں تعلیم پاتا تھا بیس ہزار طلبہ تھے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اِس نظامِ تعلیم میں ایک فرد کو اپنی ذہانت کے جوہر دکھانے کے بے شمار مواقع ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر بی۔ اے پاس کرنے کے لیے تیرہ مضامین میں کامیاب ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک ذہین طالب علم دو سال میں یا اس سے بھی کم مدّت میں ان تمام مضامین کے امتحانات میں بیٹھتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے بی۔ اے کی ڈگری مل جائے گی۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک طالب علم ایک سیشن (وہاں ایک سال میں تین سیشن ہوتے ہیں) میں صرف ایک مضمون میں کامیاب ہوتا ہے تو اسے اس بات کی سہولتیں میسّر ہیں کہ وہ ایک ایک کر کے تمام مضامین پاس کرے۔ جس مضمون میں وہ ایک دفعہ کامیاب ہو جاتا ہے اس میں دوبارہ امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔ تیسری خصوصیّت یہ ہے کہ ہر کالج اپنے طلبہ کے لیے مطالعے کے لیے سلیبس خود بناتا ہے۔ پاکستان کی طرح وہاں سلیبس اور کورس میں یکسانیت نہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں استاد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

طالب علم کی کامیابی اور ناکامی کا تمام تر انحصار استاد پر ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ استاد جس کو

چاہے ، کامیاب اور جس کو چاہے ناکام قرار دے دے ۔ بلکہ وہ ضابطے کے مطابق چلتا ہے ۔ طلبہ کے امتحانات کالج ہی کے اساتذہ لیتے ہیں ۔ پرچوں کو جانچ لینے کے بعد انہیں طلبہ کو دکھایا جاتا ہے ۔ طلبہ اپنے استاد سے پرچوں کے متعلق تفصیلی گفتگو کرنے کا حق رکھتے ہیں اور اگر پرچوں کے جانچنے میں غلطی ہوگئی ہو تو استاد اس کی اصلاح کرتے ہیں ۔ اس طرح امتحانات میں دھاندلی ، غلطی یا جانبداری کا امکان باقی نہیں رہتا ۔"

بارکر صاحب نظامِ تعلیم کی خصوصیت بتاتے رہے اور میں یہ سوچتا رہا کہ پاکستان میں بھی کبھی ایسا وقت آئے گا جب یہاں کا مزدور بھی پڑھا لکھا ہوگا اور ہر فرد پر تعلیم کے دروازے کھلے رہیں گے ۔ اب تو تعلیم محدود سے محدود تر ہوتی جا رہی ہے اور کتنے دل ہیں جن میں حصولِ تعلیم کی معصوم سی خواہش ابھرتی ہے لیکن ناسازگار ماحول خواہش کی کلی کو کھلنے نہیں دیتا ۔

تعلیم کے موضوع پر بات کافی طویل ہوگئی تھی اس لیے گفتگو کا رُخ موڑنے کے لیے میں نے بارکر صاحب سے وہ سوال کر ہی دیا جو سب سے زیادہ اہم تھا ۔

"آپ نے اسلام کیوں کر قبول کیا ؟"

"اسلام" وہ یہ کہہ کر کچھ خاموش سے ہوگئے ۔ "بھائی ، یہ ایک طویل داستان ہے ۔ گو اس کے دُہرانے میں ایک طرح کا لطف آتا ہے لیکن ماضی کی بے اعتدالیاں دل و دماغ میں تلخیاں گھول دیتی ہیں ۔" پھر انہوں نے اختصار کے ساتھ وہ ایمان افروز واقعات سنائے جن میں عبرت بھی تھی اور دعوتِ غور و فکر بھی ۔ انہوں نے بتایا کہ میرے والد مذہب سے کوسوں دُور تھے ۔ ایک دفعہ جب میں نے ان سے خدا کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواباً کہا ؟ "میں خُدا کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں ، میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور مجھے زندگی میں اس کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ ہر آسائش میسر ہے ۔" والد صاحب کا جواب میری تشفّی نہ کر سکا ۔ میں نے اپنے طور پر مختلف ادیان کا مطالعہ شروع کیا ، یہودیت اور عیسائیت کی مقدس کتابیں بنظرِ غائر پڑھیں ۔ اناجیل قدیم و جدید میں سوائے انتشار و اختلاف کے اور کچھ نہ پایا ۔ ان کی تاریخی حیثیت بھی میرے نزدیک مشکوک تھی ۔ اسلام کے مطالعے کا اس ماحول میں سوال ہی پیدا

نہ ہوتا تھا۔ اسلام کے بارے میں وہاں کے لوگوں کا عام تاثر یہ تھا کہ یہ وحشیوں، پاگلوں اور جنون زدہ لوگوں کا مذہب ہے اور ظاہر بات ہے کہ مَیں اپنے آپ کو اس وقت وحشی کہلوانے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا تھا۔ پھر جب مَیں ہندوستان آیا اور مجھے یہاں کئی سال گھومنے پھرنے اور ہندو علماء سے ملنے کے موقعے ملے، تو مَیں نے ہندو مذہب کا مطالعہ کیا۔ مگر مَیں نے اس مذہب میں مستقل اقدار کا فقدان پایا۔ اس مذہب میں کچھ ایسا اُلجھاؤ تھا کہ مَیں خود اُلجھ کر رہ گیا۔ ہندوستان کے جنوب میں ایسے ہندو آباد ہیں جن کے مذہبی عقیدے کی رُو سے ایک عورت کے ساتھ بیک وقت چھ سگے بھائی شادی کر سکتے ہیں اور وہ اپنے اس عقیدے کی بنیاد مہابھارت پر رکھتے ہیں۔ مَیں ذہنی اور روحانی طور پر اسی تذبذب پریشانی اور گومگو کی حالت میں تھا کہ ایک دن مجھے ایک نوجوان ملا، جس کے ذریعے آگے چل کر میری کایا ہی پلٹ گئی۔

یہ نوجوان مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ دینِ اشتراکیت پر ایمان لائے ہوئے تھا۔ وہ میرے قریب اس لیے آیا کہ وہ مجھے ایک امریکی ہونے کی وجہ سے ہدفِ طنز بنانا چاہتا تھا۔ مَیں شروع شروع میں اس کی طنز آمیز باتیں سنتا رہا، لیکن ایک دن مَیں نے اسے بتایا کہ مَیں اس طرح کا امریکی نہیں ہوں جس پر تم پھبتیاں کسو۔ مجھے امریکی حکومت کی پالیسی سے کوئی سروکار نہیں، مَیں تو ایک طالب علم ہوں اور سب کا دوست ہوں۔ اس کے بعد میرے اس سے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ مَیں ساتھ ہو لیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ میرے والد صاحب مولوی قسم کے آدمی ہیں، مجھے ان کی باتیں اچھی نہیں لگتیں کیونکہ وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے تم بھی ان سے زیادہ باتیں نہ کرنا ورنہ تم اکتا جاؤ گے۔

جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس کے والد نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ مَیں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ مجھے ان کی باتوں میں خلوص، صداقت اور محبت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں مجھے اسلام کے متعلق کچھ بنیادی باتیں بتائیں۔ مَیں نے ان میں وزن محسوس کیا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے تحقیق کے سلسلے میں بہار کے جنگلوں میں جانا تھا۔ انہوں نے چلتے وقت مجھے کچھ کتابیں

دیں جو زیادہ تر انگریزی میں تھیں۔ ان میں پکھتال صاحب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہُوا قرآن بھی تھا۔ مَیں نے ان کتابوں کے پڑھنے کا وعدہ کیا اور بہار کے جنگلوں میں چلا گیا۔ وہاں تنہائی تھی۔ پورا ماحول قدرت کی دلفریبیوں اور رعنائیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ طائرانِ خوش الحان اپنی نغمہ سنجیوں سے سازِ دل کے تار ہلا رہے تھے۔ وجدان ایک کیف آگیں سرور سے معمور تھا۔ خود بخود خیال آیا کہ قرآن حکیم کا مطالعہ کیا جائے۔ سورۃ کوثر کھلی، پڑھنا شروع کیا۔ چھوٹے چھوٹے بول میرے دل میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہوتے چلے گئے۔ ان کے ترنّم نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ معلوم نہیں ان میں کیا تھا کہ میری زبان بے اختیار انہیں دُہرانے لگی۔ پڑھتا چلا گیا۔ مَیں نے یوں محسوس کیا کہ آبِ حیات کے قطرے مرجھائے ہوئے پھولوں کو تازگی اور شگفتگی بخش رہے ہیں۔ دل چاہتا تھا کہ قرآن کی پاکیزہ تعلیمات پر ایمان لے آؤں لیکن مادہ پرست ماحول میں پرورش پائے ہوئے ذہن کا کبر و غرور یقین میں شک کی آمیزش کر رہا تھا۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش جاری رہی۔ یہاں تک کہ مَیں پھر لکھنؤ آگیا۔ آتے ہی انہی مولوی صاحب سے ملا اور ان تمام شکوک و شبہات کو ان کے سامنے رکھا جو میرے ذہن میں ابھی تک اسلام کے بارے میں موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر رسالت کا مقام، اسلام میں عورت کی حیثیت اور حرام اور حلال کے مسائل، سے متعلق تھے۔ مولوی صاحب نے نہایت ہی حکیمانہ اور مدلّل انداز میں میرے ہر شک کو رفع کیا۔ اب قلب و ذہن میں صداقت کو سینے سے لگا لینے کا بے پناہ جذبہ اُبھر آیا تھا۔ شیفتگی و وارفتگی خود سپردگی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ آنکھیں بے یقینی کے اندھیاریوں میں یقین و ایمان کے انوار کا مشاہدہ کرنے کے لیے بیتاب تھیں۔ میری زبان سے بے ساختہ کلمۂ توحید بلند ہُوا۔ مَیں کتنا خوش تھا، الفاظ بیان نہیں کر سکتے اور شدتِ جذبات کے اظہار میں الفاظ کو ہمیشہ اپنی کوتاہیٔ فن کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

مَیں جب امریکہ واپس گیا، اس وقت مجھ میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ میرے والد صاحب نے مجھ سے صرف ایک ہی سوال کیا: "کیا تم اب بھی شراب پیتے ہو؟" مَیں نے کہا نہیں، شراب تو اسلام میں حرام ہے۔" اس پر انہوں نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور پھر وہ الفاظ ادا کیے جو مجھے زندگی بھر یاد رہیں گے۔ "بیٹا، جو مذہب تمہیں

شراب پینے سے منع کرتا ہے، وہ یقیناً ایک اچھا مذہب ہوگا۔"

وقت گزرتا گیا اور مَیں نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اس معاشرے میں میرے لیے مسلمان کی حیثیت سے جینا بہت ہی مشکل ہے۔ یار دوست پھبتیاں کستے تھے: "نئے عہد میں پرانے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شراب اور عورت کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ تم تو وحشی بنتے جا رہے ہو۔ اپنی جوانی اور حسن کی رعنائیوں پر رحم کرو۔" شروع شروع میں یہ سب کچھ برداشت کرتا رہا اور اپنی وضع پر قائم رہا، لیکن ادھر ابھی نئے نقوش تازہ تازہ اور دھیمے تھے اور ادھر گرد و پیش کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں غیر شعوری طور پر ماحول کے دھارے پر بہنے لگا اور ایک دو سال ہی میں ان تمام آلودگیوں سے دامن تر ہو گیا جنہیں اسلام کی حرارت نے خشک کیا تھا۔

گناہ کی لذت کوشیوں، جوانی کی سرمستیوں اور لغزشوں کی دلربائیوں نے روح کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کی بجائے اسے مسلسل اضطراب اور پیہم التہاب کا مرکز بنا دیا۔ مَیں پہروں سوچتا کہ کیا زندگی بے مقصد ہے؟ سکّوں کی کھنک، جام کی گردش، نگاروں کی محفل ہی وہ سب کچھ ہے۔ جس کے لیے یہ انسان، یہ وسیع کائنات اور یہ چاند تارے تخلیق کیے گئے ہیں۔ ہر لحظہ میرا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ عموماً آنکھیں اشکبار رہتیں۔ ذہن کسی فکر میں کھویا رہتا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مَیں بالکل مایوس ہو گیا۔ سوچا جس زندگی کا مقصد ہی معلوم نہیں اُسے کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔ اسی سوچ بچار کی حالت میں مجھے نیند آ گئی۔ نیند کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا ہوں ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے جس میں پتھر اور کنکریاں بکھری ہوئی ہیں۔ چاروں طرف دیواروں پر جالے لگے ہوئے تھے۔ مَیں تاریکی میں ایک دو قدم چلتا ہوں اور پتھر سے ٹھوکر کھا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہے۔ روشنی کی تلاش میں اٹھتا ہوں، گرتا ہوں اور گر کر پھر اٹھتا ہوں۔ اتنے میں ایک کونے سے روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے۔ اس طرف لپکتا ہوں۔ ایک تنگ سا دروازہ ہے جس میں سے روشنی آ رہی ہے۔ مجھے کچھ سکون ملتا ہے۔ اس دروازے کی طرف بڑھتا ہوں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

جب جاگا تو اپنے آپ کو حد درجہ مطمئن پایا۔ مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو کامیابی اور ابدی سکون کا ضامن ہے۔ گو اس پر چلنا اتنا آسان نہیں اور قدم قدم پر نفس پر پابندیاں اور قیود عائد کرنا پڑتی ہیں لیکن راستہ صرف یہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس واقعے کے بعد سے میں بتدریج اسلام کے قریب آتا جا رہا ہوں۔"

بارکر صاحب کے بیان نے مجھے چونکا دیا۔ اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا کہ راہِ عشق و عزیمت میں کتنے قدم اٹھائے ہیں۔ کیا اپنی زندگی بے مقصدیت کی دلدل میں دھنس کر نہیں رہ گئی ہے؟ قرآن کی تلاوت روزانہ کی جاتی ہے لیکن سوزِ محبت اور احساسِ عبودیت سے آنسو کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہیں بہتا، جیسے آنکھوں کے چشمے سُوکھ گئے ہوں۔

مَیں نے بارکر صاحب سے سوال کیا کہ "آخر امریکہ میں اسلام کے خلاف نفرت کا اتنا شدید جذبہ کیوں پایا جاتا ہے؟"

وہ کچھ وقفے کے لیے خاموش رہے جیسے اسباب کا کھوج لگا رہے ہوں۔ پھر کہنے لگے: "اس کے متعدد اسباب ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو صلیبی جنگیں ہیں۔ عیسائیوں نے ان جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھ شکستوں کے جو زخم کھائے وہ انہیں ابھی تک نہیں بھولے۔ انہوں نے اس کا انتقام اس طرح لیا کہ اسلام کے متعلق گمراہ کن باتیں پھیلائیں اور مسلمانوں کے کردار کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ وہ وحشی درندوں کے مانند، ہاتھوں میں تلواریں لیے، نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے ہوئے انسانوں کی بستیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ قتلِ عام کرتے ہیں اور عورتوں کو گرفتار کر کے انہیں لونڈیاں بنا لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ موجودہ عیسائیت اتنی کھوکھلی اور بے جان ہے کہ کوئی معقول انسان اس مذہب سے وابستگی قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے اندر دماغ کو مسخر کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ اس خطرے کا سدباب اس طرح کیا گیا کہ اسلام کے صاف و سفید دامن پر بڑے بڑے داغ ڈالے گئے تاکہ اپنے بدنما داغ چھپ

جائیں اور عیسائیوں کا ذہین طبقہ اسلام کی طرف راغب نہ ہونے پائے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام کو امریکی مزاج کے مطابق پیش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مجھے کامل یقین ہے کہ اگر اسلام کو خاص انداز میں اہلِ امریکہ کے سامنے پیش کیا جائے تو ایک بڑا حلقہ اس کا اس طرح خیر مقدم کرے گا کہ گویا وہ اسی کی تلاش میں برسوں سے سرگرداں تھا۔"

"بارکر صاحب، وہ خاص انداز کونسا ہے؟" میں نے بے قراری کے عالم میں پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ "میں ابھی بتاتا ہوں۔" اتنے میں چائے آگئی۔ چائے کے ساتھ ہی شاعروں کا ذکر چل نکلا۔ قمر میرٹھی صاحب ہمارے پہلو میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی غزل کے دو شعر سُنائے ؎

لگ گئی آگ بلا سے، جو نشیمن کو مرے
اہلِ گلشن تو ہوئے برق و شرر سے آگاہ
چھوڑ جاتے جو نہ ہم نقشِ کفِ پا اپنے
کوئی ہوتا نہ تری راہ گزر سے آگاہ

"اہلِ گلشن تو ہوئے برق و شرر سے آگاہ" اس مصرع نے تصورات اور خیالات کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچادی۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو اپنا سب کچھ اس لیے لُٹا دیتے ہیں کہ دوسروں کے لیے زندگی زیادہ حسین، زیادہ آسان اور زیادہ خوش گوار بن جائے اور ایک ہم ہیں کہ اپنی زندگی کو رنگین بنانے کے لیے دوسروں کی خواہشات اور ارمانوں تک کا خون چُوس لیتے ہیں۔ حقیقت ہے بھی یہی کہ جب تک ہزاروں آشیاں بنا کر پھونک نہ ڈالے جائیں، اس وقت تک اہلِ گلشن کو برق اور شرر سے آگاہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ عشق، محبت اور دعوت و عزیمت کی راہ کچھ ہے ہی ایسی کہ یہاں سب کچھ لُٹانا ہی ہوتا ہے۔

چائے ختم ہوئی تو میں نے اپنا پہلا سوال دہرایا: "وہ کیا اندازِ خاص ہے جس میں اسلام کو اہلِ امریکہ کے سامنے پیش کیا جائے۔"

بارکر صاحب نے جواباً کہا: "دراصل وہاں کے لوگوں کا مزاج مشرق کے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ کسی شخص کی بات پر یقین لانے سے پہلے اس بات کی تاریخی حیثیت کو دیکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہمارے پاس کیا تاریخی ثبوت ہے کہ یہ بات اس شخص نے کہی ہے۔ اس اعتبار سے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں نے اسماء الرجال کے سلسلے میں جو بیش بہا اور عدیم المثال تحقیقی کام کیا ہے اُسے انگریزی میں منتقل کیا جائے۔ اہلِ مغرب پر یہ بات پورے اہتمام کے ساتھ واضح کر دی جائے کہ اسلام کا ذخیرۂ علم تاریخی اعتبار سے جتنا مستند اور یقینی ہے، دُنیا کے کسی اور مذہب کا نہیں۔ روایت و رایت اور جرح و تعدیل کے جو اصول مسلمان محدّثین اور فقہاء نے منضبط کیے، تاریخ محفوظ رکھنے اور اس پر تنقید کرنے کے ان سے زیادہ معقول اور کڑے کوئی اور اصول نہیں ہو سکتے۔

قرآن اور حدیث کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے کے بعد دوسرا یہ قدم اٹھایا جائے کہ انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوائی جائیں جن میں حوالہ جات کا خاص اہتمام ہو۔ یورپ ہو یا امریکہ، وہاں کے لوگ حوالہ جات سے بہت مرعوب ہوتے ہیں۔ ایک نہایت ہی عمدہ کتاب اگر بغیر حوالوں کے ہے تو وہاں اسے کوئی وزن نہیں دیا جائے گا۔ تیسری اہم بات جسے پیشِ نظر رکھنا نہایت ہی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی ان تعلیمات کو زیادہ نمایاں حیثیت دی جائے جن کا تعلّق انسان کے معاشرتی، تمدّنی اور اخلاقی زندگی سے ہے۔ پاکیزگی، طہارت، صفائی، سادگی، قرینہ جو رسُولِ خدا صلعم کی تمدّنی زندگی کے نمایاں اوصاف تھے، انہیں وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت مغرب میں اپنی زندگی کے طور و طریق سے حد درجہ بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ ایسے وقت میں اگر مسلمانوں کی طرف سے زندگی کا ایک ایسا واضح نقشہ پیش کیا جائے جو طمانیت، سکون، محبّت اور معتدل روش اور دنیوی خوش حالی کا ضامن ہو تو یقیناً اُدھر کے لوگ اس کو خوشی خوشی قبول کریں گے۔ دراصل وہاں کے لوگ ہر چیز کو مادّی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں، اس لیے اس امر کو بھی خاص طور سے واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام نہ صرف روحانی پاکیزگی اور

اخلاقی حس ابھارتا ہے بلکہ معاشرے کو خوشحالی اور مادی ترقی کی انتہا سے بھی ہم کنار کرتا ہے "۔

مَیں نے بارکر صاحب پر ایک پُر امید نگاہ ڈالتے ہوئے پُوچھا: "کیا آپ ان خطوط پر اسلام کو پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر سکتے ؟"

"کیوں نہیں، میری زندگی کا اور مقصد ہی کیا ہے۔ اس سے زیادہ اور میری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ مَیں اسلام کے کسی کام آسکوں "۔ یہ تھے بارکر صاحب کے الفاظ جنہوں نے میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ وہ کہے چلے جا رہے تھے :

"مَیں نے اس سلسلے میں ایک پروگرام بھی وضع کر لیا ہے۔ مَیں اہم موضوعات پر پاک و ہند کے علماء سے مضامین لکھوانا چاہتا ہوں۔ مَیں نے ممتاز علماء سے مضامین لکھنے کی درخواست کی ہے۔ کچھ علماء تعاون کا ہاتھ بڑھانے میں فراخدلی کا ثبوت نہیں دے رہے۔ شاید ان کی عدیم الفرصتی اس کا سبب ہو۔ میری خواہش یہ ہے کہ ایک اسلامک ریڈر تیار کیا جائے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں۔ اردو کے اسلامک ریڈر کے ذریعے پاکستان میں تعلیم بالغان کے اصولوں پر یہاں کے لوگوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پھیلایا جائے اور انگریزی زبان کے ذریعے سے مغربی دنیا کو اسلام سے روشناس کرایا جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں لیکن اس شعر کے مصداق ؎

منزل تو تھی ہی پیشِ نظر راہِ شوق میں ۔۔۔ کچھ پیچ و خم بھی ذوقِ سفر بخشتے رہے

راستے کی صعوبتیں ذوقِ سفر کو نکھارتی ہی جائیں گی "۔

"اپنے سینے میں کتنے صحت مند جذبات لیے ہوئے ہے یہ شخص"، مَیں نے اپنے آپ سے کہا۔ کاش! ہم ان ذمہ داریوں کو پہچان لیں جو شہادتِ حق کا فریضہ ہم پر عائد کرتا ہے۔ ہم اپنی تمام صلاحیتوں، قابلیتوں اور مال و متاع کو اشاعتِ اسلام کے مقدس مشن میں کیوں نہ لگا دیں۔ عیسائی مشنریاں ہمارے ملک میں آکر اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں اور ہم ردِ عمل کے طور پر صرف حرفِ شکایت زبان پر لے آتے ہیں۔ لیکن شاید ہم یہ نہیں جانتے کہ شکایت وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو کم ہمت اور بے عمل ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں عیسائیت تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہم

صرف تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ کاش ہمارے دماغوں میں یہ سودا سما جائے کہ ہم نے خدا کا پیغام دنیا کے آخری کونے تک پہنچانا ہے۔ اسلام ایسے دیوانوں کا منتظر ہے۔

"ایک عام امریکی پاکستان کے بارے میں کیا تاثرات رکھتا ہے؟" میں نے بارکر صاحب سے ایک اور سوال کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مسکرائے اور پھر سگار ہونٹوں میں سنجیدگی تحلیل کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "عام امریکی پاکستان کے بارے میں اچھے تاثرات رکھتا ہے۔ امریکیوں کے دلوں میں اہلِ پاکستان کے لیے دوستی اور خیر سگالی کے بے پناہ جذبات موجزن ہیں۔ پچھلے سال جب ایوب صاحب امریکہ گئے تو وہاں کے دانشوروں پر نہایت گہرا اثر چھوڑ کر آئے۔ میرے پاس میرے بہت سے دوستوں کے خطوط آئے ہیں جن میں تحریر تھا کہ ایوب صاحب نے سینٹ میں جو تقریر کی وہ جرأت مندی، بیباکی، جوشِ خطابت اور حُسنِ استدلال کا ایک شاہکار تھی اور اس نے فی الواقع ہمارے سوچنے کے انداز کو بدل کر رکھ دیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ابھی اس میدان میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ امریکہ میں پاکستان کو ابھی تک مؤثر انداز میں متعارف نہیں کرایا گیا۔ اس سلسلے میں کئی محاذوں پر کام کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ پاکستانی سفارت خانہ دانش مندی، جوشِ عمل اور سبک روی کا ثبوت دے۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور دوسرے تعلیمی اور ثقافتی اداروں میں پاکستان کے مؤقف کو پیش کیا جائے۔ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیے جائیں۔ وہاں کے اخبار و رسائل میں مضامین لکھے جائیں۔ امریکہ کے عوام کے ساتھ گھلا ملا جائے۔ ایک امریکی بہت جلد کھل جاتا ہے لیکن یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ سفارتخانے کے عملے کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جائے۔ یعنی ایسے لوگ اس اہم کام پر مامور کیے جائیں جو ایک طرف پاکستانی عوام کے جذبات و احساسات سے بخوبی واقف ہوں اور دوسری طرف انہیں عام لوگوں کے ساتھ گھلنا ملنا بھی آتا ہو۔ ان کے علاوہ وہاں ایسی فلمیں دکھائی جائیں جن میں پاکستان کی عوامی زندگی کی صحیح عکاسی اور تصویر کشی کی گئی ہو۔ اب تک جو فلمیں دکھائی جاتی رہی ہیں، ان میں زیادہ تر حکومت کی سرگرمیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ امریکی ان روکھی پھیکی رودادوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔

پھر وقتاً فوقتاً پاکستان کے عوام میں سے لوگوں کو امریکہ بھیجا جائے۔ یہ لوگ پاکستان کے لیے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں بشیر شتربان کے جانے سے پاکستان کا نام دیہات دیہات پہنچ گیا۔ دراصل ہمارے ہاں طبقہ بندی نہیں ہے۔ ہم تکلفات سے بالاتر ہو کر عوام کی سطح پر رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہرے کبھی متاثر نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان خطوط پر کام کیا جائے تو پاکستان کو امریکہ میں بہت زیادہ پبلسٹی مل سکتی ہے۔"

وقت دبے پاؤں ہمارے پاس سے اس طرح گزرا کہ ہمیں اس کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ ایک بج چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ بارکر صاحب کو کھانا بھی کھانا ہوگا۔ مجھے ان کے معمولات کو درہم برہم نہیں کرنا چاہیے۔ بارکر صاحب نے میرے چہرے سے میرے خیالات کو پڑھ لیا اور کہا: "ابھی ہم آدھ گھنٹہ اور گفتگو کر سکتے ہیں۔"

میں خوشی سے جھوم اٹھا اور ساتھ ہی ایک سوال بھی داغ دیا:

"بارکر صاحب، آپ کے ہاں جو آزاد صنفی اختلاط پایا جاتا ہے کیا اس نے آپ کے معاشرے میں سنگین مسائل پیدا نہیں کر دیے؟"

"جی نہیں، ہمارے ہاں جنس اب کوئی مسئلہ نہیں۔" پھر وہ رُکے اور ان کے چہرے پر اضطراب کے آثار پھیلتے چلے گئے۔ الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا: "دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی ماحول اور مشرق کے معاشرتی ماحول میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک پر دوسرے کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں جب ایک فرد سولہ سترہ سال کی عُمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے والدین اسے علیحدہ کر دیتے ہیں، تاکہ وہ اپنے طور پر زندگی میں جدوجہد کرنا سیکھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب ایک شخص چھوٹی عمر ہی سے زندگی کے حقائق سے دوچار ہوتا ہے، نئے نئے تجربات کرتا ہے، اُٹھ اُٹھ کر گرتا ہے اور گر گر کر اٹھتا ہے تو وہ اپنی پوری زندگی خود اعتمادی، عملی فراست اور آزادروی کے ساتھ گزارتا ہے۔ ہمارے تصوّر میں بھی یہ نہیں آسکتا کہ والدین کی محبّت اولاد کی ترقی کی راہ میں بھی حائل ہو سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرق میں والدین سے علیحدہ ہو جانے

کو نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے اور یہ الفاظ تو مَیں نے اکثر مردوں سے ان کے تیس تیس سالہ لڑکوں کے متعلق سُنے ہیں:
"ابھی کیا ہے، وہ تو ابھی بچّہ ہی ہے۔ عُمر کے ساتھ ساتھ عقل بھی آجائے گی۔" ایک باپ نے نہایت فخریہ انداز میں مجھ سے کہا تھا: "جب تک مَیں زندہ ہوں مَیں اپنے بچّوں کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔" اور ایسے واقعات تو اکثر ہوتے رہتے ہیں کہ ایک لڑکا اپنی ذہانت اور قابلیت کی بناء پر بڑھنا چاہتا ہے۔ غیر ممالک میں اس کے لیے تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور اپنے مستقبل کو زیادہ شاندار بنانے کے مواقع ہیں لیکن ماں کی ممتا اسے اپنی آنکھوں سے دُور رکھنا گوارا نہیں کرتی اور وہ ایک جگہ سمٹ کر اپنی ساری فطری صلاحیتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ شادی بیاہ کا ہے۔ ہماری زندگی کا سارا انتظام ہی کچھ ایسا ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے ہمارے سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے سے ملنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں معاشرتی آداب سکھائے جاتے ہیں اور انہیں آئندہ کی عملی زندگی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ جب لڑکا سولہ سترہ سال کی عُمر کو پہنچتا ہے تو وہ لڑکیوں میں سے کسی کو منتخب کر کے اس سے دوستانہ روابط قائم کرتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ لڑکی، لڑکے کے گھر آتی ہے، اسی طرح لڑکا، لڑکی کے گھر جاتا ہے۔ تین چار سال تک یہ ایک دوسرے کے مزاج اور جذبات و احساسات اور خصائل و عادات کا قریب سے مطالعہ کرتے ہیں۔ دونوں کے والدین انہیں اپنی رائے اور تاثرات سے بھی آگاہ کرتے رہتے ہیں اور جب ایک مدّت تک اس طرح قریب رہنے کے بعد وہ ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں تو ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ اپنی ملاقاتوں میں شائستگی، تہذیب اور اخلاق کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں لڑکیوں کے چھیڑ چھاڑ کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ ہم جنسی جذبات کو دبا کر نہیں رکھتے۔"

"لیکن بارکر صاحب، نوجوان مرد اور عورت ایک دوسرے کے متعلّق صحیح فیصلہ کم ہی کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی شخصیت کا مطالعہ اس نظر سے کر رہے ہوتے ہیں جس میں پسند کا عنصر پہلے ہی سے غالب ہوتا ہے۔ جذبات کی غیر جانبدارانہ مطالعہ ممکن ہی نہیں۔" مَیں نے بارکر صاحب کو درمیان ہی میں سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"آپ کی رائے بالکل غلط نہیں۔ غلطی کا امکان یقیناً موجود ہے لیکن اتنا بلکہ اس سے بھی زیادہ غلطی کا امکان اس انتخاب میں بھی ہے جو والدین کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

مَیں مسکرا دیا۔ مَیں نے دل میں سوچا واقعی مشرق اور مغرب میں بڑا فرق ہے۔ مغرب میں محبت پہلے کی جاتی ہے اور شادی بعد میں اور مشرق میں شادی پہلے ہوتی ہے اور محبت بعد میں کی جاتی ہے۔

موضوع بدلنے کے لیے مَیں نے آخری سوال کیا۔ "امریکہ میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ اسلام کی اشاعت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں؟"

بارکر صاحب نے کہا کہ "کچھ حلقے اچھے خاصے مستعد نظر آتے ہیں، لیکن سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں عجیب عجیب فرقے پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہاں مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ بھی ہے جس نے یہ تصوّر پیش کیا ہے کہ خدا کالے رنگ کا ہے۔ اس فرقے کے عقائد حبشیوں میں بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔"

ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ مَیں نے بارکر صاحب سے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ ان کے ہاتھوں کی گرمی اور چہرے کی شگفتگی آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

سمن آباد کی مین روڈ پر قصرِ سخاوت کے دامن میں ایک مختصر سا حسین بنگلہ واقع ہے جس میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب چار پانچ سال سے اقامت گزین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اورینٹل کالج، ادبی محفلوں اور علمی مذاکروں میں تو بارہا قریب سے دیکھا تھا لیکن انھیں اس عالم میں پہلے کبھی دیکھنے کا موقع میسّر نہیں آیا تھا۔ درحقیقت ایک فرد کی شخصیت کو اس وقت صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں جاسکتا جب تک وہ رکھ رکھاؤ اور تکلفات کی قیود سے آزاد نہ ہو۔

۱۹ر جون کی ایک خنک شام کو ہماری آنکھوں نے سیّد صاحب کی زندگی اور شخصیت کی چند جھلکیاں دیکھیں۔ ایسی جھلکیاں جنہیں بار بار دیکھنے کے لیے نگاہیں دیوانہ وار اٹھتی رہیں گی۔

سید صاحب کی عمر پچپن سال سے متجاوز ہے اور زندگی کے اس طویل اور کٹھن سفر کے نشانات چہرے کی کیفیات سے ظاہر ہیں لیکن آنکھوں میں تقدیر کی گہرائیاں جھانک رہی ہیں اور ان میں موجِ حوادث سے کھیلتے رہنے کی ایک آرزوئے ناتمام کروٹیں لیتی نظر آتی ہے گویا کہہ رہی ہوں ؎

رہرو راہِ محبت تھک نہ جانا راہ میں　　　لذّتِ صحرانوردی دوریٔ منزل میں ہے

ان کی گفتار سنجیدگی و مزاح کا ایک تیکھا انداز لیے ہوئے ہے۔ الفاظ میں محبت کی گھلاوٹ اور صبح کی شبنم کا ٹھہراؤ ہے۔ دل میں اعلیٰ اقدار کے تحفظ کی کسک اور لگن انہیں اکثر بے قرار رکھتی ہے اور مَیں نے جب انھیں سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے قلب و روح کی پاکیزگی اور باطن کے نور نے سپید لباس کا روپ دھار لیا ہے۔ ان کی پوری زندگی مسلسل کشمکش اور جد و جہد میں گزری اور جب کوئی ان کی زندگی کا باشعور اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتا ہے، تو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عظمت و سربلندی مسلسل ریاضت اور جگر کاوی کا مطالبہ کرتی ہے اور جو اس کے بغیر اسے حاصل کرنے کے تمنائی ہیں وہ "اہلِ نظر" نہیں۔ "بوالہوس" ہیں۔

س : آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات اور تعلیم و ملازمت کے کوائف مطلوب ہیں۔

ج : ؎ از نام چہ پرسی کہ مرا ننگ ز نام است
وز ننگ چہ پرسی کہ مرا نام ز ننگ است

ایک زمانے میں اس قسم کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مَیں کہا کرتا تھا ع
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بر دوشم

زندگی کی روداد مختصر طور پر شعروں ہی میں بیان ہو سکتی ہے اگر آپ کو شعر سے دلچسپی ہو تو یوں کہوں ؎

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم
اپنی تو یہ مختصر ہے رُوداد

مگر شاید ان شاعرانہ رموز سے زیادہ آپ کو اس وجودِ بے سود کے متعلق چند ٹھوس کوائف کی ضرورت ہوگی۔ تو سنیے۔ میں ۱۹۰۶ء میں ضلع ہزارہ تحصیل مانسہرہ کے ایک خوبصورت پہاڑی کی چوٹی پر آباد گاؤں) منگلور میں پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں یہاں سکھوں نے ایک گڑھی تعمیر کر رکھی تھی، کیونکہ یہ مقام اتنی بلند جگہ پر واقع ہے کہ یہاں سے ہزارہ کی تینوں تحصیلوں کے راستے اور رقبے پیشِ نظر رہتے ہیں۔

چاروں طرف نالے اور چشمے اور مرغزار اور وادیاں اور آبشاریں ہیں۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ان کے تذکرے میرے روزنامچے (صحیفۂ زندگی) میں کبھی ملاحظہ فرما لیجئے گا۔

میرے والد حکیم سید نور احمد شاہ، صاحبِ علم اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ اپنے زمانے کے خوبصورت اور ذہین لوگوں میں سے تھے۔ بڑے ضابطہ پسند، صابر اور جابر، مگر اس فولادی کردار کے اندر نرمی و ملائمت کے انداز بھی رکھتے تھے۔ ابھی میں چھٹی جماعت ہی کا طالب علم تھا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وجہ سے میری طبیعت زندگی بھر محبت کی پیاسی رہی اور اندر کا زخم کسی اور محبت سے بھر نہ سکا۔

پرائمری اپنے گاؤں میں، مڈل مانسہرہ میں، نویں جماعت ایبٹ آباد میں پاس کی۔ پھر جبکہ ابھی لڑکپن کا آغاز ہی تھا میں زمانے کی سب سے بڑی سیاسی تحریک 'خلافت' میں شریک ہو گیا اور اسی کے سلسلے میں تعلیم کو ترک کر کے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں پہنچا۔ سوجھ بوجھ کچھ زیادہ نہ تھی مگر محمد علی، ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ، مولانا سورتی، مولانا اسلم جیراجپوری وغیرہ کو دیکھا اور سنا۔ اس سے طبیعت میں سیاست، آزادی اور علم کی لگن جاگ اٹھی۔ تحریکِ خلافت کے سرد پڑ جانے پر جبکہ شیرازۂ احوال بکھر چکا تھا بے سر و سامانی کے عالم میں لاہور کی مسجدوں میں عربی کی تعلیم پائی اور اس ضمن میں مولانا احمد علی، مولانا غلام مرشد، حافظ محمد حسین، مولانا عبدالواحد غزنوی سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد اورینٹل کالج میں مولوی عالم میں داخل ہو کر مولانا عبدالعزیز میمن کے علم و فضل سے سیراب ہوا۔ اس کے بعد منشی فاضل اور اسی سلسلے سے صرف انگریزی کے سب امتحان پاس کر کے ۱۹۲۵ء میں ایم اے فارسی کا، ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی کا، ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ، جرمن انٹرمیڈیٹ اور لائبریری سائنس کا امتحان پاس کیا۔

اورینٹل کالج سے میرا تعلق ۱۹۲۴ء سے ہے اور اسی زمانے سے پروفیسر اقبال، پروفیسر شیرانی اور پروفیسر شفیع سے یکے بعد دیگرے متعارف ہو کر بقدرِ استطاعت فیض یاب ہوا۔ ان سب اساتذہ کا ممنونِ احسان ہوں۔

میری ملازمت سب ایک ہی سلسلے کی ہے۔ قلمی کتابوں کی فہرست سازی (۲۶-۲۷)، ریسرچ سکالرشپ (۲۷ تا ۳۲) لائبریرین عربی (۳۵ تا ۳۹) لیکچرار فارسی (۳۸ تا ۴۰) لیکچرار اردو (۴۰ تا ۴۵) ریڈر اردو (تا ۵۲) پروفیسر اردو (از ۵۲ تا حال)، پرنسپل اورینٹل کالج (از ۵۴ تا حال) اس وقت میں صدر شعبۂ عربی بھی ہوں اور صدر شعبۂ اردو بھی ___ اور عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کا استاد ہوں اور تینوں ادبوں کا خادم۔ تینوں زبانوں کے ادب کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا بھی ہے۔

س : آپ ادب کا کیا تصور رکھتے ہیں۔ زندگی کے سلسلے میں اس کی کیا اہمیت ہے ؟

ج : مناسب یہ ہوگا کہ پہلے فن پر کچھ گفتگو ہو جائے کیونکہ ادب بھی ایک فن ہے۔ یہ اس لیے کہ آجکل اس کے متعلق بہت سی پریشاں خیالی پائی جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو فن انسانی طبیعت کے ایک ناگزیر داخلی تقاضے کو پورا کرتا ہے اور اپنی اصل میں بڑی آزاد بے ساختہ اور معصوم چیز ہے۔ یہ دراصل ان جذبوں اور خیالوں سے متعلق ہے جن کی کڑی تنظیم ممکن نہیں۔ یہ جذبے اور خیال طبع انسانی میں کچھ اس طرح اگ آتے ہیں جس طرح مرغزار دل میں خود رَو پھول اُگ آتے ہیں۔ شاعر یا فن کار ان پھولوں کے اگانے میں آزاد مگر مجبور سا ہوتا ہے اور بڑی حد تک خارجی جبر اور قید سے بے نیاز، اندر کی تحریک سے اظہار پر مائل ہوتا ہے ___ ایسی صورت میں اس کے ارادے پر کسی خارجی مقصد کا دباؤ نہیں ہوتا، نہ اس کے ارادے میں خیر و شر کا کوئی جھگڑا، اچھائی، برائی کی کوئی لڑائی ہوتی ہے ___ وہ تو مرغزار کے اس پھول کے اندر سے خود بخود ابھرا چلا آتا ہے اُبھرا چلا آتا ہے یا یوں کہیئے شاعر کی مخصوص فطرت بے ساختہ اس کو بروئے کار لاتی رہتی ہے اور اس کے زیر اثر فن اور ادب کے پھول کھلتے رہتے ہیں، کھلتے رہتے ہیں۔

س : تو آپ کا مطلب یہ ہوا کہ فن اور ادب بلا ارادہ اور بے مقصد ظہور میں آتے ہیں ؟

ج : جی ہاں، مگر ایک چیز کو نہ بھولیے کہ ادبی یا فنی اظہار، کسی داخلی یا خارجی تحریک کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ

تحریک زندگی کے شعور اور حسن کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر زندگی کا شعور یا حسن کا احساس، یہ دونوں چیزیں ناقابلِ تعریف ہیں اور ان کو عقلی تعریفوں اور تشریحوں میں مقید کرنا ممکن نہیں۔ تو میں نے یہ کہہ دیا کہ فن اور شاعری ایک لحاظ سے وجدان و الہام کی طرح کی چیزیں ہیں جو کسی کے تابع نہیں۔ حافظ نے اسی لیے کہا تھا:

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم
کہ من دل شدہ ایں راہ نہ بخود می گویم

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
ہر چہ استادِ ازل گفت بگو می گویم

اور میں تو نظیری کی اس بات کو بھی کچھ اہمیت نہیں دیتا جس نے حافظ کی نقالی کرتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا ع

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی خارج سے کوئی وجود یا شخص شاعری کرا رہا ہے۔ شاعری اور فن (لاکھ خارجی رنگ کے حامل ہوں) ان کی اصل داخلی، شدید داخلی ہے۔ وہ فطرت کی ان اتھاہ گہرائیوں سے نمودار ہوتا ہے، جن کا راز خدائے کائنات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ع

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے

س: ڈاکٹر صاحب! آپ نے تو فن کو بہت ہی مجرد شے بنا دیا ہے۔ اس صورت میں اس کا خارجی زندگی سے گویا کچھ تعلق نہ ہوا؟

ج: میں عرض کرتا ہوں کہ فن کی اصل مجرد، منزّہ، پاکیزہ ہے، معصوم ہے جس طرح سر چشمے کا پانی اپنے منبع میں ہر غل و غش سے پاک ہوتا ہے۔ ادب کا بنیادی سرچشمۂ تحریک بھی بے لوث ہوتا ہے، نیکی، حسن اور معصومیت اس کی صفاتِ خاص ہیں۔ وہ ایک معنی میں بے نام عبودیت کے جذبے سے ابھرتا ہے،

بے نام گداز سے، بے نام خودی سے! البتہ اظہار کے مراحل میں فن کار خارجی وسائل اور خارجی مواد سے کام لیتا ہے ۔۔ یہ مواد ایسا ہوتا ہے جو ماحول اور سوسائٹی کے احوال سے اسے ملتا ہے۔ اس معنی میں فن یا ادب ایک شعوری سماجی عمل بھی بن جاتا ہے اور یہیں پہنچ کر فن کار پر اخلاقی اور سوشل ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں مگر اصل تحریک بے ساختہ آزاد اور معصوم ہوتی ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب! آپ کا موسیقی، مصوّری وغیرہ کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ج : میرا خیال ہے کہ اگر یہ فنون اس ذوقِ عبودیت سے ابھریں یا اس بے نام اور معصوم بے خودی کا نتیجہ ہوں، جس کا مَیں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے تو فن ایک غیر جانبدار اور معصوم بلکہ پاکیزہ فعل ہے۔ موسیقی تو درکنار، مصوّری کا عمل بھی ایک روحانی لگن کا نتیجہ ہے اور ذاتِ مطلق کی دریافت اور رسائی کا ایک وسیلہ ہے ۔۔ یہ دراصل جستجو ہے اس ذاتِ مطلق کی جس کی تجرید، ذہنِ انسانی کے لیے معمّہ بن جاتی ہے۔ اسی معمہ کی کشود، ایک مصوّر کی آرزو ہوتی ہے ۔۔ ذاتِ مطلق کو دیکھنے کی کوشش! ہر چند کہ آپ اسے کوششِ ناتمام ہی کہہ سکتے ہیں۔

س : مگر ڈاکٹر صاحب! مسلمانوں کے زمانے میں عام رائے مصوّری کے خلاف رہی ہے۔

ج : مَیں نے جس حد تک مسلمانوں کے شعور کا مطالعہ کیا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ مصوّری کے متعلق قدرے بے التفاتی کا رویّہ اس لیے رہا کہ مسلمانوں کو اس کے رواجِ عام میں یا اس کی تقدیس میں بھی افراط و تفریط کا وہ خطرہ نظر آیا جو بالآخر بت پرستی تک پہنچا سکتا ہے۔ مَیں اس سلسلے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ مَیں جب کبھی الحمراء میں تصویروں کی نمائش دیکھنے جاتا ہوں تو بعض لوگوں کو عجب حالت میں دیکھتا ہوں۔ یعنی وہ پہروں تصویروں پر آنکھیں جمائے کھڑے رہتے ہیں اور استغراق اور بے خودی کا وہ عالم ان پر طاری ہوتا ہے جو مسلمانوں کے تصوّر میں عبادتِ ربّ العباد سے مخصوص ہے۔

عبادت کا لمحہ زندگی کا وہ لمحہ ہوتا ہے جب شعورِ انسانی محسوسات سے عارضی طور پر کٹ کر

خدا سے جا ملتا ہے اور یہ حالتِ لطیف مسلمانوں کے تصوّر میں مادی وسائل کی وساطت کے بغیر ہونی چاہیے۔ یہ شاید اسلام کا ایک بہت بڑا تجربہ ہے کہ اس میں عبودیت اور عبادت کے راستے بلا واسطہ خدائے کائنات سے جوڑے جاسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی اس معاملے میں کسی وسیلے اور واسطے کا محتاج ہے تو اس کے دل میں گویا ابھی تک سومنات اور اس کے بت موجود ہیں۔ مصوّر کی تصویر کو دیکھ کر تعجب اور تحسین اور گداز کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو باشعور شخص عبادت اور عبودیت کے اس رنگ سے جدا کرسکتا ہے جو خالقِ کائنات سے ہم کلامی اور اس کے ذکر و فکر سے وابستہ ہے۔ ایسی مصوّری یا فن پرستی سے بت پرستی کا کوئی خطرہ نہیں۔

س: ڈاکٹر صاحب! آپ کا پاکستانی کلچر کے متعلق کیا خیال ہے؟

ج: میرے نزدیک کلچر اور ثقافت وغیرہ مغربی اصطلاحیں ہیں اور ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم ان اصطلاحوں کے غلام ہو کر اپنے اعتقادیات کو انہی سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک پاکستانی کلچر مغربی اصطلاح کے تحت بھی، ابھی ظہور میں نہیں آیا۔ کسی قوم کا کلچر، اس کے عقائد، ماحول اور زندگی کے طویل تجربے کے تابع ہوتا ہے۔ اس سے قوموں کی آزاد اجتماعی عادتیں اور ذوقی رویّے ابھرتے ہیں، جن میں تعدیل، حسن اور سلیقہ کی شان نمودار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کلچر میں حسن کا ہونا ضروری ہے۔ ہم لوگ ہندوستانی، پاکستانی، تاریخی واقعات کی پیداوار ہیں۔ ہمارا ایک "ہند مسلمانی" کلچر تھا جس پر ہمارے ذوق و ذہن کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اب بھی پاکستان میں اس کے نقوش مل جاتے ہیں مگر انتشاری قوتیں اس ذوقی نظام کو منتشر کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا پاکستانی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ، مستقبل کا مسئلہ ہے۔ اس کی عمارت ان عقائد پر قائم ہو گی جن پر اس ملک کی وسیع آبادی جمی ہے گی محض پاکستانی موسیقی اور مقامی مصوّری کو پاکستانی ثقافت کہہ دینے کی حرکت بڑی قابلِ اعتراض ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب! پاکستان میں اردو کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : مَیں کام اور جد و جہد میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ملک کے صحیح الخیال لوگ، ملک کی وحدت کی خاطر اردو کے تحفظ پر ڈٹے رہیں تو اور کوئی خطرہ نہیں۔ اس وقت اردو کو کمزور کرنے کے لیے علاقائیت کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے ۔ یہ دراصل انگریزی کے بے جا اقتدار کو برقرار رکھنے کی ایک سازش ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ قوم بہت جلد علاقائیت کے خطرے کا احساس کرے گی۔ مغربی پاکستان میں حکومت نے اردو کو بارھویں جماعت تک لازمی قرار دے کر ملک کی وحدت کے لیے ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ اس سے پاکستان کو بہت فائدہ ہوگا۔

س : کیا عربی فارسی کی موجودہ پوزیشن سے آپ مطمئن ہیں ؟

ج : مَیں سخت غیر مطمئن ہوں۔ عربی فارسی کو ان کا جائز حق نہیں ملا۔ اس سے علومِ مشرقیہ، علومِ اسلامیہ، زبانِ اردو اور ملک کی عام علمی ترقی کو شدید نقصان پہنچے گا۔ عربی، فارسی کو مثل سابق میٹرک یا ایف۔ اے میں لازمی مضمون بنانا چاہیے۔

س : آپ کا تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ج : میرے نزدیک کمیشن کی سفارشات میں بہت سی کارآمد دفعات ہیں اور قومی تعلیم کا ایک عمدہ فلسفہ ان سے مرتب کیا جا سکتا ہے ۔ مگر مَیں نہیں کہہ سکتا کہ نافذ کرنے کے عمل میں کیا صورت پیش آتی ہے۔

س : آپ کے نزدیک معیاری تعلیمی منصوبے کے کیا لوازم ہیں ؟

ج : دراصل ہر تعلیمی منصوبے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہُوا کرتا ہے اور ہر نظامِ تعلیم کسی تعلیمی فلسفے کے مطابق مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس سوال کا جواب دیتے وقت اسلامی اور قومی تصورات کو مدِّ نظر رکھنا ہوگا۔ ایک اچھا انسان بنانا اور باشعور شہری بنانا اچھے نظامِ تعلیم کا وصف ہونا چاہیے مگر پاکستانی نظریات کی رُو سے، پاکستانی نظامِ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے کالجوں، مدرسوں سے اچھے مسلمان پیدا ہوں ؛ جہاں تک مَیں نے دیکھا، کمیشن کی سفارشات میں "مسلمان" کی تعریف مشکوک و مخدوش ہے۔

اس میں EMPHASIS بے ضرورت اور بے محل "ماڈرن" پر رکھا گیا ہے مگر کسی جگہ یہ نہیں بتایا گیا کہ ماڈرن ضروریات ہیں کیا۔ یہاں تک کہ دینی تعلیم میں بھی محض سپرٹ کا ذکر ہے، ارکانِ اسلام اور عبادت کے لیے تربیت کا کوئی سامان نہیں۔ میرے خیال میں ہماری تعلیم کا مقصد دین و دنیا کی فلاح ہے مگر مسخ شدہ دین کی نہیں۔ ورنہ میں ذاتی طور پر ایسے تصوّرِ دین کے مقابلے میں، خالص دنیا داری کو افضل خیال کروں گا۔

س : آپ کا سیکولر طرزِ حکومت کے متعلق کیا خیال ہے ؟

ج میرے خیال میں یہ مصیبت بھی مغربی اصطلاح کی آوردہ ہے۔ یہ عیسائی طرزِ استدلال ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھی دنیاوی حکومت اور عادل نظامِ حکومت اسلامی طرزِ حکومت کا اولیں وصف ہے۔ میں موجودہ حالات میں اچھی سیکولر حکومت کو بھی بُرا خیال نہ کروں گا۔ اس اثناء میں ایک نئے علم الکلام اور نئی فقہ کی تدوین کی ضرورت ہے جس کی روشنی میں مجوزہ عادلانہ سیکولر حکومت کے خاکے میں اسلامی رنگ بھرا جا سکتا ہے۔

س : آپ اپنے ذاتی ذوق، مسلک اور مشرب کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں ؟

ج : یہ سوال آپ کی طرف سے مجھ پر زیادتی ہے، اس سے اس لڑائی کا راز آشکارا ہو جائے گا جو مسلسل بیس برس سے میرے اور میرے نفس کے درمیان جاری ہے۔ میں ایک غم پسند آدمی ہوں۔ اس کے زیرِ اثر میں نے اپنا ایک فلسفہ مرتب کیا تھا جسے کبھی کبھی میں میر تقی میرؔ کے تتبع میں فلسفۂ دردمندی کہہ لیا کرتا ہوں، مگر میرا یہ فلسفہ بار بار بکھرتا رہتا ہے اور میں اسے پھر جمع کر لیا کرتا ہوں۔ دردمندی کے اس تصوّر میں ضمیر داری، ہمدردی، قربانی، درگزر، محبتِ عام اور ذوقِ بے خودی سبھی چیزیں شامل ہیں۔ مگر کس کی محبت اور کیسی ضمیر داری! آزمائش کی دنیا بڑی آزمائش میں مبتلا رہتی ہے اور من کی دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ زندگی میں میرا سب سے بڑا رفیق شعر ہے۔ میر اگنگنانا ہر جاگتے لمحے تک

پھیلا ہُوا ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑا ندیم آسمانی دوست ہے جس کی ہم کلامی (دعا) سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ مگر اب ایسے لمحے بھی آتے رہتے ہیں جب یہ دونوں رفیق میرا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور میں ایلی۔ ایلی لما سبقتنی کہتا ہُوا بھٹکتا پھرتا ہوں۔

س : زندگی کا کوئی دل چسپ اور سبق آموز واقعہ؟

ج : جب میری زندگی ہی بے نتیجہ ہے تو بڑا واقعہ کہاں سے آئے گا۔ البتہ چند واقعات سے گہرا اثر لیا۔ اس موقعہ پر صرف ایک واقعہ نقل کرتا ہوں :-

مَیں ایف۔اے کا امتحان دے رہا تھا کہ لاہور کے بڑے کالجوں کے پرنسپلوں میں سے کوئی شخص پرائیویٹ طلباء کے فارموں پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مجھ سے کسی نے کہا لالہ رگھبیر دیال پرنسپل سناتن دھرم کالج سے ملو، مَیں گیا، اپنی باری پر بلایا گیا۔ کرسی پر سے ایک شخص اٹھا۔ دو دست بستہ نمستے کہا، بٹھایا۔ فارم لیا۔ دستخط کیے اور کہا۔ کاکا جی! جب بھی کوئی کام ہو بے تکلّف آجایا کرو۔ پھر بڑے انکسار سے دوبارہ نمستے کہا اور رخصت کیا۔ ! مَیں جو کہ پندرہ روز سے بڑے بڑے پرنسپلوں کے دفتروں کے سامنے دھکّے کھا رہا تھا حیرت زدہ ہُوا اور سوچنے لگا: شائستگی ہو تو منصب اور انکسار کا اجتماع ممکن ہے۔ واقعہ معمولی ہے مگر مجھ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہُوا۔

س : ڈاکٹر صاحب! زندگی کی کوئی آرزو؟

ج : بھئی آرزوئیں تو بہت ہیں مگر ایک ایسی آرزو ہے جو اکثر جان و دل میں بسی رہتی ہے اور وہ یہ کہ کاش مَیں اپنی زندگی میں دس پندرہ سطریں ایسی لازوال لکھ جاؤں جو انسانی دُکھ درد میں کسی مورِ ناتواں کے لیے سفینۂ برگِ گل بن سکے۔ ! مَیں اس قسم کی ایک سطر بھی ابھی تک نہیں لکھ سکا۔ سقراط دانش کی ایک چمک کے لیے پہاڑیوں کے گرد دیوانہ وار گھوما۔ مَیں سیاہی کے ایک قطرے کا آرزو مند ہوں جو تحریر میں ڈھل کر مرہم بن جائے۔

مولانا غلام رسول مہر

آج سے چودہ سال پہلے جب میری عمر بمشکل چودہ سال کی تھی، مشرقی پنجاب کے ایک ریگستانی خطے سرسہ میں ادیب عالم کی تیاری کر رہا تھا۔ نصاب میں مولانا غلام رسول مہر کی کتابیں شامل تھیں۔ ان کی ایک کتاب غالب سے متعلق تھی۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے میرے دل میں اکثر خیال آتا کہ اس کتاب کے خالق کو نظر بھر کر دیکھا جائے، جس نے غالب کی عظمتِ فن کو اچھوتے انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اسے اپنے جگر کا خون پلایا ہے، لیکن معاً دوسرا خیال آتا کہ ایک دور افتادہ صحرا نشیں کی یہ قسمت کہاں۔

پاکستان بنا اور میں اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور آیا۔ اچھرہ کی سرزمین نے ہم بے خانماؤں کو سینے سے لگایا۔ مجھے صبح کی سیر کا شوق بچپن ہی سے تھا، چنانچہ تڑکے اٹھتا اور نہر، جو اچھرے سے ایک میل کے فاصلے پر ہے، کی طرف سیر کے لیے نکل جاتا۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں مسلم ٹاؤن کی کچی پگ ڈنڈیوں پر چل رہا تھا کہ میں نے سرِ راہے کچھ فاصلے پر تین چار آدمیوں کو ایک چھابڑی والے سے امرود لیتے ہوئے دیکھا۔ اس سارے منظر کی سادگی میں نجانے کیا کشش تھی کہ میں بھی وہاں

پہنچ گیا اور ان کے ساتھ امرود کھانے میں شریک ہو گیا۔ ان میں میرے ایک شناسا بھی نکل آئے۔ انہوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

" انہیں جانتے ہو؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا:

" آپ غلام رسول مہر ہیں۔"

یہ الفاظ سُن کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میرے تصوّر نے جس کی بارہا خیالی تصویریں بنائی تھیں، اس کا جیتا جاگتا پیکر میرے سامنے تھا۔ میں نے بار بار اس کی طرف دیکھا اور ہر بار نگاہیں اس کی سادگی اور بے تکلفی سے سرشار ہو کر لوٹیں۔ اس کے بعد مہر صاحب سے کئی مرتبہ اور ملنے کا اتفاق ہُوا، ان سے اہم مسائل پر گفتگو ہوئی۔ میں ان کے بعض خیالات سے اختلاف رکھتے ہوئے ہمیشہ ان کے خلوص سے متاثر ہو کر اٹھا ہوں۔

مہر صاحب ستّر کے پیٹے میں ہیں لیکن ان کے جسم میں صحت مند خون دوڑ رہا ہے۔ چال ڈھال اور آواز میں جوانوں کی سی تیزی اور پھرتی ہے۔ یہ یقیناً اس لیے ہے کہ وہ باقاعدگی سے صبح سویرے اٹھتے ہیں، سیر کے لیے جاتے ہیں اور تمام امور باقاعدگی سے سرانجام دیتے ہیں۔ سر کے بال غائب ہیں جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس دماغ نے سخت ریاضت کی ہے۔ عینک کے شیشوں میں سے تیز، روشن اور گہری آنکھیں جھانکتی ہیں جو دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ سنجیدہ اور علمی باتوں میں اکتاہٹ پیدا نہیں ہونے دیتے۔

لباس کی سادگی کی طرح ان کا مزاج بھی سادہ نظر آتا ہے۔ مزاج کی اس سادگی نے انہیں جرأت مند اور نڈر بنا دیا ہے۔ ان کے یہ الفاظ میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے ہیں:۔

" الطاف صاحب، میں لوگوں سے ڈر کر اپنی رائے کو نہیں چھپایا کرتا، جو رائے رکھتا ہوں،

اس کا اعلان کر دیتا ہوں چاہے اس کا اظہار مصلحتِ وقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ سستی شہرت کے حصول یا مخالفت کے ڈر سے میں اپنی رائے نہیں بدلا کرتا۔"

بلاشبہ یہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جو اپنے کچھ اصول رکھتے ہیں اور ہوا کے رُخ کے ساتھ بدل نہیں جاتے۔

س : اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات بتائیے۔

ج : "یوں تو زندگی کی روداد بہت طویل ہے۔ مختصراً عرض کیے دیتا ہوں کہ میں غالباً مئی ۱۸۹۵ء میں ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں پھولپور میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں جالندھر سے چار پانچ میل جنوب میں واقع تھا۔ میرے والد بزرگوار ـــ محمد علی خاں ذات کے اعوان تھے اور اچھے خاصے خوشحال تھے۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ میں ان میں سب سے بڑا تھا۔ والد صاحب کو میری تعلیم کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اپنے اس بچّے کو ولایت تک تعلیم دلواؤں گا۔ میں گیارہ سال کا تھا کہ والد کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ مرتے وقت انہوں نے صرف ایک وصیّت کی جو محض میرے متعلق تھی۔ وہ یہ کہ خواہ کوئی صورت پیش آجائے، میرے بچّے کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے اور جتنا بھی خرچ کرنا پڑے، بے دریغ کیا جائے۔ میری والدہ اور دادی صاحبہ نے مجھے شفقت اور محبت سے پالا اور یہ کہنے میں میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس میں سب سے بڑا حصّہ میری والدہ مرحومہ کا ہے۔"

س : آپ نے تعلیمی سفر کا آغاز کب کیا اور اس سفر کی چند خوش گوار یادیں؟

ج : تعلیم کا آغاز ایک دیہاتی مدرسے سے ہوا جو میرے گاؤں سے قریب کے ایک گاؤں میں تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہمارے اساتذہ تعلیمی مشاغل سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی

کا واحد مقصد طلبہ کی شخصیت میں اپنے آپ کو جذب کر دینا تھا۔ پرائمری درجے تک وہ بلا مبالغہ دن میں بارہ بارہ گھنٹے پڑھاتے تھے اور سردیوں کے موسم میں تو رات کے وقت بھی دو تین گھنٹے محنت کراتے تھے۔ ہم سوتے بھی سکول ہی میں تھے۔ ان اساتذہ کی صحبت میں محنت و ریاضت کی جو عادت پڑی، وہ بفضلِ الٰہی آج تک قائم ہے۔ ایسے محنتی اور فرض شناس اساتذہ اب کمیاب ہیں۔ مجھے سکول اور کالج میں بھی ایسے اساتذہ کے زیرِ سایہ تعلیم و تربیت کا موقع ملا جن کی زندگی کا نصب العین طلبہ کی فلاح و بہبود تھا۔

مشن ہائی سکول جالندھر سے ۱۹۱۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ حصولِ تعلیم کا شوق لاہور کھینچ لایا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا اور یہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجھے بچپن سے دل چسپی تو تاریخ کے ساتھ تھی لیکن بی۔ اے میں مَیں نے تاریخ چھوڑ کر فلسفہ لے لیا۔ فلسفے میں مَیں نے ایف اے میں نہیں پڑھا تھا اور لوگ اس مضمون کی مشکلات سے ڈراتے تھے لیکن استاذِ مشفق کی معیت میں یہ سفر نہایت خوش گوار کٹا۔

س: کالج میں آپ کے کون کون سے قابلِ ذکر اساتذہ تھے اور ان میں آپ سب سے زیادہ کن سے متاثر ہوئے؟

ج: یوں تو کالج کے اکثر پروفیسر اپنے اپنے مضمون میں یگانہ تھے، مگر ان میں سے مولانا اصغر علی روحی، پروفیسر ایم۔ اے غنی، مسٹر ہنری مارٹن پرنسپل، خواجہ دل محمد اور مولانا محمد عمر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پروفیسر ایم۔ اے۔ غنی، شیکسپیئر کے ڈرامے اس انداز سے پڑھاتے تھے کہ وہ ڈرامے کے جیتے جاگتے کردار بن جاتے۔ مسٹر ہنری مارٹن کو اکنامکس کے علاوہ انگریزی شاعری میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ جو لطف ان سے انگریزی نظمیں پڑھنے میں آیا، زندگی بھر پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ ان سب اساتذہ میں مولانا روحی ایک خاص امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔

مجھے ان کے قریب آنے کے مواقع شروع ہی سے میسّر آگئے تھے۔ میری فارسی کی علمیت کو دیکھتے ہوئے میرے استاد مولانا محمد عمر خاں نے میرے لیے فارسی کی کلاس میں حاضری کی پابندی اٹھا دی تھی۔ مولانا روحی اس پیریڈ میں فارغ ہوتے تھے، وہ حقّے کے عادی تھے، اس لیے ہوسٹل میں آجاتے تھے۔ میں پہلے سے حقّہ تیار کر رکھتا تھا۔ بریلواز ہوسٹل کے صحن میں مناسب جگہ کرسی رکھ دی جاتی، وہ حقہ پیتے اور ہم چند نیاز مند ارد گرد زمین پر بیٹھے ہوتے اور ان کے ارفع خیالات سے مستفید ہوتے رہتے۔ انہیں تعلیم و تدریس سے دیوانگی کی حد تک شغف تھا۔ مولوی محمد شفیع صاحب ان کے بارے میں بتایا کرتے ہیں کہ وہ کالج سے نکلتے تو ہم ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتے اور وہ بازاروں اور کوچوں سے گزرتے ہوئے ہمیں سبق پڑھاتے جاتے۔ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ کہاں چلے گئے یہ درویش جن کے قدموں کی آہٹ سے علم و ادب کے پھول کھلا کرتے تھے اور جن کی نظر سے فکر و خیال کے اَن گنت چراغ روشن ہو جایا کرتے تھے۔ آہ! ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے ساتھ علم و تحقیق کی دنیا بھی ویران ہوتی چلی جا رہی ہے۔

س : مہرؔ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کا تخلّص ہے۔ آپ نے شاعری کا آغاز کب سے کیا؟

ج : شعر و شاعری سے مجھے فطری لگاؤ تھا۔ اشعار مجھے اس وقت بھی اچھے لگتے تھے، جب مجھے انہیں سمجھنے کا شعور نہیں تھا۔ ان دنوں جالندھر میں نصابی کتابوں کے علاوہ عام علمی کتابوں کی دوکانیں بہت کم تھیں۔ مجھے سب سے پہلے ضامنؔ کا دیوان پڑھنے کا موقع ملا، جو غالباً تین آنے کا ملتا تھا۔ میں اس کی غزلوں پر غزلیں کہتا تھا۔ پھر میں نے غالبؔ کے دیوان کا ایک حصّہ اپنے استاد مولانا حکیم محمد سلیم مرحوم (ساکن بستی غزنوی) سے سبقاً سبقاً پڑھا۔ اس وقت غالبؔ کے ساتھ جو وابستگی پیدا ہوئی اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ ناسخؔ کے دونوں دیوانوں کو دس آنے میں خریدا۔ اس طرح شاعری کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ سیاسی اور صحافتی سرگرمیاں میری زندگی کے دائرۂ مشاغل پر

غالب آگئیں۔

س : کیا آپ نے سیاسی زندگی میں حصّہ لینے کے بعد شاعری کا سلسلہ ختم کر دیا؟

ج : جی نہیں، شعر اب بھی کہتا ہوں میری رائے یہ ہے کہ ذوقِ شعری میں ایک خاص درجہ حاصل کیے بغیر ادب کی لطافتوں اور نزاکتوں کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ جب تک آپ خود ان مقامات سے نہ گزریں جن سے گزر کر ایک شاعر نے اشعار کہے ہیں اس وقت تک نہ آپ اس تخلیق کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ فنّی کاوشوں اور کاہشوں سے لذّت یاب ہو سکتے ہیں۔ شعر میں کمال حاصل کرنا ہو تو اس کے لیے کامل انہماک اور یک سوئی میرے نزدیک لازم ہے۔ شاعری کو کسی دوسرے پیشے سے اشتراک منظور نہیں۔ یا تو صرف اس کے لیے وقف ہو جانا چاہیے یا شعر کی دیوی سے التفاتِ خصوصی کا متمنی نہ ہونا چاہیے۔

س : موجودہ دَور کی شاعری کے بارے میں آپ کیا تاثر رکھتے ہیں؟

ج : بھئی، سچی بات یہ ہے کہ مَیں موجودہ دَور کے شاعروں میں سے بعض کو بہت اچھا شاعر سمجھتا ہوں اور بعض کی فنی تخلیقات کی قدر و قیمت سمجھنے سے قاصر ہوں۔ غالباً اس لیے کہ ان کی اڑان اتنی بلند ہے کہ میرا طائرِ خیال وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جو کانوں سے ٹکراتے ہی دل میں اتر جائے اور جذبات سے ہم آہنگ ہوتے ہی زباں پر رواں ہو جائے۔

س : آپ نے میدانِ صحافت میں کن حالات میں قدم رکھا؟

ج : اس میدانِ خارزار میں میرا داخل ہونا غالباً میرے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ شاید غالبؔ کا یہ شعر میرے ہی لیے تھا:-

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

بی-اے پاس کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے - انگریزی ملازمت میرے مزاج اور ضمیر کے خلاف تھی۔ مَیں مسلم ریاستوں میں ملازمت اختیار کرنے کو اس وقت زیادہ اچھا سمجھتا تھا (مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ان ریاستوں کی حالت انگریزوں کے ماتحت علاقوں سے بھی زیادہ خراب ہے) چنانچہ یہی خیال ہم دو تین آدمیوں کو حیدر آباد (دکن) لے گیا اور مَیں وہاں ذکار الدولہ بہادر کے محکمۂ تعلیم کا انچارج بن گیا۔ ان دنوں مجھے مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ سے گہری وابستگی تھی۔ غالب اور بعض دوسرے اکابر شعراء کے کلام کی طرح مولانا کے مضامین و مقالات بھی مجھے لفظاً لفظاً یاد تھے۔

مولانا نے حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھی تھی۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ آزادی اور اسلام کا پیغام جگہ جگہ پہنچانے کے لیے کارکنوں کا ایک گروہ تیار کرلیں۔ مَیں بھی اس جماعت کا ممبر بن چکا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا کو بنگال سے اخراج کا حکم ملا اور وہ رانچی چلے گئے، ان کے مکان کی تلاشی میں جن کاغذات پر حکومت نے قبضہ کیا تھا، ان میں حزب اللہ کے ممبروں کا رجسٹر بھی تھا۔ جن لوگوں کے پتے اس رجسٹر میں درج تھے ان سب کے متعلق چھان بین اور تفتیش کے احکام متعلقہ اضلاع میں بھیج دیے گئے۔ ہم نے انہی دنوں یہ فیصلہ کیا تھا کہ کوئی اخبار یا رسالہ نکالا جائے۔ لیکن ان احکام کی بناء پر ہمیں اجازت نامہ نہ مل سکا۔ کچھ مدت کے بعد ملک کے سیاسی حالات خاصے پریشان کن ہو گئے۔ جنگِ عظیم کے خاتمے پر اتحادیوں نے ترکی سلطنت کو ختم کر دینا چاہا جس کی بناء پر مسلمانانِ ہند میں اضطراب پیدا ہوا۔ ملک میں ترکِ موالات کی تحریک جاری ہوئی۔ مَیں حیدر آباد سے واپس آیا اور جالندھر میں سیاسی کام شروع کر دیا۔ دراصل مَیں اخبار جاری کرنا چاہتا تھا، لیکن دوستوں نے مشورہ دیا کہ پہلے کسی اخبار میں کام کر کے تجربہ حاصل کر لو اور "زمیندار" کا نام تجویز کیا۔ چنانچہ مَیں نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور آ گیا اور زمیندار کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گیا۔ اس سے پیشتر مولانا ظفر علی خاں، اختر علی خاں اور مولانا عبدالمجید سالک گرفتار ہو چکے تھے۔ شفاعت اللہ خاں اخبار

کے مینیجر تھے۔ مَیں چار پانچ روز کے بعد سامان لینے گھر گیا، والدہ صاحبہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ مَیں خطرناک مشغلہ اختیار کر رہا ہوں، انہیں یہ گوارا نہ ہُوا اور مجھے روک دیا۔ اتفاق یہ ہُوا کہ چند روز کے بعد "زمیندار" کی ضمانت کسی تحریر پر ضبط ہو گئی اور اخبار تھوڑی مدت کے لیے بند رہا۔ جب اس کے دوبارہ اجراء کا انتظام ہُوا تو شجاعت اللہ خاں خود میرے وطن پہنچے، والدہ صاحبہ کو یقین دلایا کہ مہر کا کوئی رسمی تعلق اخبار سے نہ ہو گا۔ وہ الگ مکان میں رہے گا۔ اس طرح اجازت ملی تو فروری ۱۹۲۲ء میں مستقل طور پر زمیندار میں آیا اور اواخر مارچ ۱۹۲۷ء تک وہاں رہا۔ پھر مَیں نے اور سالک مرحوم نے بعض حالات کی بناء پر زمیندار سے استعفیٰ دے دیا۔ ترکِ ملازمت کے وقت یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا کہ اب یکسوئی کے ساتھ کوئی علمی کام کریں گے لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہمارے سارے پروگرام کو بدل کے رکھ دیا۔

س: وہ واقعہ کیا تھا؟

ج: واقعہ یہ تھا کہ جس روز ہم زمیندار سے مستعفی ہوئے، اسی شام کو اخبار کا پورا عملہ کام چھوڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ ہم نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ کام جاری رکھیں، لیکن وہ تیار نہ ہوئے۔ ہمارے لیے پندرہ بیس آدمیوں کا خرچ برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ مَیں نے سالک صاحب سے اس سنگین صورتِ حال کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے گزارے کا بندوبست اخبار جاری کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اخبار جاری کرنے کی تجویز بھی پیش کر دی یعنی احبابِ خاص سے استمداد۔ احباب نے ایسی فراخ حوصلگی سے امداد کی کہ ایک ہی دن میں نئے اخبار کے اجراء کا اشتہار تیار ہو گیا۔ ابھی اخبار کا کوئی نام تجویز نہیں ہُوا تھا۔ ہم معمول کے مطابق حضرت علامہ اقبالؒ سے ملنے کے لیے گئے۔ انہوں نے ازراہِ نوازش ہمیں اپنی مشہور نظم "انقلاب اے انقلاب" سنائی۔ اس نظم کی بناء پر اخبار کا نام "انقلاب" تجویز ہُوا اور یہ نظم پہلی مرتبہ انقلاب کی پہلی اشاعت کے صفحہ اوّل پر شائع ہوئی۔

س: مولانا ظفر علی خاں کو آپ نے قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کا ان کی شخصیت کے متعلق مجموعی تاثر کیا ہے؟

ج: مَیں شخصیتوں کے بارے میں عموماً اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں، تاہم مولانا کے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کیے دیتا ہوں۔ مولانا جوشِ عمل، خلوص و انہماک اور تندی و تیزی میں اپنی مثال آپ تھے۔ جن لیڈروں نے عوام میں زیادہ سے زیادہ کام کیا، ان میں ہمہ گیر بیداری پیدا کی، مَیں سمجھتا ہوں ان میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ کام شروع کر دیتے تھے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر حال میں اسی کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ کوئی شخص کسی بھی غرض سے ان کے پاس پہنچ جاتا، اُسے اپنی بات تفصیل سے سنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ غور و فکر کے بعد منظم سکیمیں بنانے سے ان کی طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی، لیکن جس چیز کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اس کے لیے سعی و عمل میں اپنی تمام قوتیں لگا دیتے۔ اسلام اور مسلمانوں سے ان کو جو محبت اور شیفتگی تھی، اس کی مثالیں بہت ہی کم ملیں گی۔

س: صحافت کے ذریعے سے آپ کن مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے؟

ج: میرے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد رہا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی حالت زیادہ سے زیادہ بہتر ہو جائے۔ مَیں نے اپنی صلاحیتِ غور و فکر کے مطابق اس کے سوا کبھی اور کسی مقصد کے لیے کام نہیں کیا۔

پاک و ہند میں مسلمانوں کی خوشحالی و آزادی دیکھنے کے علاوہ اپنی یہ آرزو رہی کہ تمام عالمِ اسلام میں محبت اور یگانگت کے رشتے استوار ہو جائیں۔ پھر اس کے ذریعے سے پوری انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی جائے۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام ہی ایک ایسی عالمگیر تحریک ہے جو پوری کائنات کو ایک مرکزی نقطے پر لا سکتی ہے۔ انقلاب کے فائل گواہ ہیں کہ ہم اس کام کے لیے وقف رہے۔

س: تراجم کو زبان و ادب میں کیا حیثیت حاصل ہے اور آپ تراجم میں کن بنیادی امور کو پیشِ نظر

رکھتے ہیں؟

ج : میرے نزدیک زبان و ادب میں تراجم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کسی دوسری زبان سے استفادے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو وہ زبان سیکھ لی جائے یا پھر اس زبان کے علوم اپنی زبان میں منتقل کیے جائیں۔ تراجم کے ذریعے سے آپ بہت زیادہ زبانیں سیکھے بغیر بھی بہت سے زبانوں کے مطالب، اسلوب اور علوم سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان اب جس دور سے گزر رہی ہے اس کے لیے تراجم بالکل ناگزیر ہیں کیونکہ ان کے بغیر اردو کا دامن گوناگوں علمی خزانوں سے بھرا نہیں جا سکتا۔

مَیں ترجمہ کرتے وقت حتی الامکان دوسری زبان کے الفاظ کی پابندی کرتا ہوں بلکہ اسلوب تک کو برقرار رکھنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ مَیں اسے جائز نہیں سمجھتا کہ دوسری زبان کے صرف مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر دیا جائے۔ اس میں قباحت یہ ہے کہ عین ممکن ہے مترجم مصنّف کے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکا ہو۔

س : انیسویں اور بیسویں صدی میں سرزمینِ پاک و ہند میں جو مختلف سیاسی اور دینی تحریکیں اٹھتی رہیں، آپ کے نزدیک ان کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟

ج : سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک کا مقصد احیائے دین تھا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کے تسلّط کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

سر سیّد احمد خاں نے جن حالات میں قومی خدمت کا بیڑہ اٹھایا، وہ یہ تھے کہ انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکا تھا اور یہاں کی سب سے بڑی اکثریت —— ہندو نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کا تعلق استوار کر لیا تھا۔ نتیجتہً مسلمان جو اقلیت میں تھے، بے بسی اور مایوسی کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے۔ سر سیّد احمد دیکھ رہے تھے کہ اگر مسلمانوں نے انتظامیہ میں اپنا

جائز حصہ نہ لیا تو وہ بھی بہت جلد اچھوت کے درجے تک پہنچ جائیں گے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ جن مشکلات میں سر سیّد احمد نے کام کیا وہ بہت کم لیڈروں کو پیش آئی ہونگی۔ حاکم یعنی انگریز مسلمانوں سے بدظن اور متنفّر تھے۔ اکثریت یعنی ہندو مخالف یا کم از کم ان کی بے چارگی پر مطمئن تھے۔ ادھر مسلمان انگریزوں کی ہر چیز سے متنفر تھے۔ ان حالات میں سر سید مرحوم نے انگریزی تعلیم کی تحریک اٹھائی، اسے کامیاب بنایا اور مسلمانوں کو انتظامیہ میں داخل ہو کر اپنی حیثیت بحال کر لینے کے مواقع میسّر آگئے۔ جو ۱۸۵۷ء میں بظاہر ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھی، وہ کم سے کم مدت میں ایک زندہ و پایندہ قوم بن گئی اور اس درجہ زبردست قوم کہ حاکموں اور اکثریت دونوں کو اس سے تصفیہ کیے بغیر قدم آگے بڑھانے کی جراُت نہ ہوئی۔ کیا کسی شخص کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہ سر سیّد مرحوم کے کام کا ثمرہ تھا اور کیا اس حقیقت سے کوئی اختلاف کر سکتا ہے کہ جن لیڈروں نے مختلف سیاسی تحریکات میں مسلمانوں کی قیادت میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا، انہوں نے سر سیّد کی تحریک کے دامن ہی میں تربیت پائی تھی۔

کانگرس کا مقصد ابتداء میں انگریزوں کے تحت داخلی و انتظامی اصلاحات کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کی حفاظت کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس کی زندگی کے تین دور ہیں:۔

(۱) پہلے دَور میں اس نے مسلمانوں کی مستقل ہستی منوانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ یہ دَور ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنؤ پر ختم ہو گیا۔

(۲) دوسرے دَور میں اس نے پاک و ہند کی دوسری قوموں خصوصاً اکثریت سے ایسے سمجھوتے کی سعی کی جس میں مسلمانوں کی انفرادی، ملّی ہستی ہر گزند سے محفوظ رہے۔ یہ دَور ۱۹۳۷ء پر ختم ہو گیا۔

(۳) تیسرا دَور وہ ہے جس میں عزت مندانہ سمجھوتے کی ہر مخلص کوشش ناکام ہوئی اور مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ کو جداگانہ قومی وطن کا مطالبہ کرنا پڑا۔ یہ مطالبہ ۱۹۴۷ء میں منزلِ تکمیل پر پہنچا۔

تحریک خلافت کا بنیادی نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی اور جزیرۃ العرب کے تحفّظ کے لیے منظم و متحد کیا جائے۔

ترکِ وطن کی تحریک بھی اپنے پیچھے ایک واضح مقصد لیے ہوئے تھی۔ تحریکِ خلافت کی تنظیم سے پیشتر علماء کے فتوے سے یہاں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہنچتی کہ لاکھوں مسلمان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لیے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی۔ جب تحریکِ خلافت مستحکم ہو گئی اور کانگریس کے تعاون سے پورے پاک و ہند نے تین مطالبوں پر اتفاق کیا یعنی :-

(۱) خلافت و جزیرۃ العرب کا تحفّظ۔

(۲) مظالمِ پنجاب کی تلافی۔

(۳) سوراج۔

تو پھر تحریکِ ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہی اور ملک کے اندر ہی مؤثر کام کے مواقع میسّر آ گئے۔

س : مولانا، کن حالات اور محرکات نے آپ کو تحریکِ احمد شہیدؒ پر کام کرنے کی ترغیب دلائی؟

ج : شروع ہی سے میری یہ خواہش تھی کہ ان بہادروں کی تاریخ مرتّب کی جائے جنہوں نے وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آزادی کا پرچم بلند کیا۔ دین سے ایک گونہ لگاؤ کی وجہ سے میری طبیعت کا زیادہ تر میلان سیّد احمد شہید کی طرف تھا۔ مختلف اصحاب سے جب اس تحریک کے بارے میں سُنا، تو آتشِ شوق اور بھی تیز ہو گئی۔ پھر اس تحریک کے بارے میں متضاد باتیں سنی گئیں جس کی وجہ سے تحقیق کا خیال اور بھی پختہ ہو گیا جب خود آزادی کی جد و جہد میں شامل ہوا تو سیّد احمد شہیدؒ کی عظمت کا احساس اور بھی شدید ہو گیا۔ ان تمام احساسات

نے مجھے اس کام کے لیے تیار کیا اور بالآخر خدا کی نصرت و تائید سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

س: مولانا! اتنے عظیم الشان کام کی تکمیل میں آپ کو یقیناً بہت سی دشواریاں پیش آئی ہوں گی؟

ج: جی ہاں، تحقیق کا کام ہوتا ہی کٹھن ہے اور یہ ایسا کام تھا جس پر پہلے بہت ہی کم مواد موجود تھا اور جو تھا وہ بھی منتشر اور رطب و یابس سے پُر۔ مجھے اب یہ پختہ یقین ہو چلا ہے کہ قدرت مجھ سے یہ کام کروانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کام کے دوران میں قدرت معجزنما طور پر میری رہنمائی اور دستگیری کرتی رہی۔ صرف ایک واقعے پر اکتفا کروں گا۔ سید احمد شہیدؒ کے سلسلے میں مجھے ایک کتاب جسے وقائع احمدی کہا جاتا ہے، کی ضرورت تھی۔ مَیں ایک روز دوپہر کے وقت سویا ہوا تھا کہ باہر کسی کی آمد کا احساس ہوا، اٹھا اور دیکھا تو ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ مَیں نے پوچھا کس لیے زحمت فرمائی؟ فرمایا ایک چیز تمہارے لیے لایا ہوں۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی کتاب تھی۔ کھول کر دیکھا تو وقائع احمدی کی ایک جلد تھی، جس میں سید احمد شہید کی شہادت کے قریب تک کی تمام روایات مجتمع تھیں۔ ۱۹۳۴ء سے مَیں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مسلسل ۲۳ سال تک اس میں منہمک رہا۔

س: مولانا! سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے مسلمانانِ پاک و ہند پر مختلف حیثیتوں سے کیا اثرات مرتب کیے؟

ج: میرے خیال میں اس تحریک نے پورے برِصغیر پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ممکن ہے کہ ایک ظاہر بین نگاہ ان اثرات کو نہ دیکھ سکے، لیکن جو آنکھ اذہان و قلوب میں دوڑتی ہوئی لہروں کو دیکھتی ہے، وہی اس تحریک کے عظیم الشان اور مستقل اثرات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اس کا مقصد احیائے دین تھا۔ وہ تحریک اس مقصد میں کس حد تک کامیاب رہی، اس امر کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بنگال میں ایک قابلِ رشک جوش و خروش کے ساتھ دینی کام ہو رہا ہے۔ یو۔ پی میں مسلمان آج بھی جو صوم و صلوٰۃ کے پابند نظر آتے ہیں وہ بھی اسی تحریک کا اثر ہے۔ پاکستان کے طول و عرض میں آج بھی تحریک کے

داعی خاموشی سے سرگرم کار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پاک و ہند کے مسلمانوں کے سینوں میں آج بھی اسلام کی عظمت و سربلندی کے لیے جو کسک باقی ہے، وہ اسی تحریک کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اتنی بڑی اور اتنی عظیم الشان تحریک کے متعلق عام مسلمان کچھ بھی نہیں جانتے۔

اس تحریک کا دوسرا بڑا کارنامہ تعمیرِ سیرت ہے۔ یہ اتنا عظیم کارنامہ ہے کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ اس تحریک نے اپنے پیروؤں میں دیانت و امانت کو اس طرح پیوست کر دیا تھا کہ اس سے تاریخ پاک و ہند کے سب سے عظیم الشان تاریخی کردار ابھرے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ دس لاکھ کی رقم چندوں کے ذریعے اقصائے بنگال، بہار، یو۔پی، بمبئی، مدراس سے مختلف ہاتھوں اور مراکز سے گزر کر سرحد پہنچتی ہے اور اس کثیر رقم میں ایک دمڑی کا بھی غبن نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ صرف ایک بار پیش نہیں آیا بلکہ ۱۸۲۷ء سے لے کر آج تک ہزارہا بار وقوع پذیر ہوا ہے اور تاریخ نے غبن کا ایک واقعہ بھی ریکارڈ نہیں کیا۔ جس تحریک نے ایسے انسان پیدا کیے، اسے کون ناکام قرار دے سکتا ہے؟

اس تحریک کا تیسرا قابلِ غور تنظیمی پہلو ہے۔ اس تحریک کی تنظیمی صلاحیتوں کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے۔ اس تحریک کا قائدِ تحریک کا جو تنظیمی ڈھانچہ قائم کر گیا، وہ آج تک قائم ہے اور بغیر کسی خارجی سہارے کے از خود چل رہا ہے۔

سیاسی اعتبار سے بھی اس تحریک کا بہت بلند مقام ہے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ سب سے پہلے منظّم طور پر اسی تحریک نے بیدار کیا اور آخر اسی جذبے کی برقِ تپاں انگریزوں کے کاشانے پر گری اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جنگ کا منظّم آغاز اسی تحریک سے ہوا۔

س: آپ کے نزدیک اسلام میں ثقافت کا واضح تصوّر کیا ہے؟

ج: ثقافت فکر و عمل کے ایسے نظام کا نام ہے جس میں حسن کا پہلو نکلتا ہو۔ اسلام ایک مکمّل ضابطۂ حیات

ہے، اس لیے زندگی کے رہن سہن کے اصول بھی اس میں موجود ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ میں واضح اور معین الفاظ میں اسلامی ثقافت کی تفصیل پیش کردوں تو یہ کام ایک طویل مضمون کا تقاضا کرتا ہے اور میں جلد ہی اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ البتہ اتنا ضرور کہے دیتا ہوں کہ رقص اور رنگ رلیوں کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔

س : اقبال کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : میں اقبال کو ایک ایسا بلند پایہ شاعر ہی نہیں، داعی سمجھتا ہوں جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اقبال میں شاعری کے بہترین جوہر موجود تھے، مگر دراصل شاعری اس کے پیغام و دعوت کا ایک حسین اور دل کش لباس تھی۔ اس نے اسلام کی روح اور اس کے تقاضوں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا تھا کہ اس کے بیشتر اشعار قرآن اور حدیث کے مطالب کی تفسیر بن گئے ہیں۔ جو لوگ مرحوم کے افکارِ عالیہ کے نظائر مغربی فلسفے میں ڈھونڈتے ہیں، یا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبال نے فلاں فلاں چیزیں مغرب سے لیں، ان پر مجھے سخت تعجب ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنے عہد تک کے علمی ذخیروں سے کم و بیش استفادہ کرتا ہے۔ اقبال نے بھی یقیناً استفادہ کیا، لیکن اس کا اصل جوہر اسلام ہے۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا، وہ سب کچھ اسلام اور حقائقِ اسلام کی دعوت میں صرف ہوا۔ اقبال کی شاعری ترقی وارتقاء کے مختلف مدارج طے کرتی رہی۔ میری نگاہ میں ارمغانِ حجاز اقبال کا شاہکار ہے۔ اس تخلیق میں شاعر نے عقلیت اور جذباتیت کو ایک حسین امتزاج کے ساتھ سمویا ہے۔ میرے نزدیک اعلیٰ ترین شعر وہ ہے جو بیک وقت ایک حقیقت بھی محسوس ہو اور جذبہ بھی — یعنی دل کو بھی متاثر کرے اور عقل بھی اس پر لبیک کہے۔ ارمغانِ حجاز کی اکثر رباعیاں ایسے اشعار کی زندہ مثالیں ہیں۔ میری نظر سے شاعری کا ایسا بیش بہا مجموعہ کوئی نہیں گزرا۔

س : غالب کی عظمت کے سبھی معترف ہیں لیکن ہر ایک کا عظمت ناپنے کا پیمانہ مختلف ہے۔ آپ کے

نزدیک غالبؔ کی عظمت کن باتوں سے وابستہ ہے؟

ج: فی الواقع غالبؔ اردو اور فارسی شاعری کا بہت ہی عظیم شاعر ہے اور خالص شاعر کی حیثیت میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کے بیشتر اشعار زندگی کی مختلف حقیقتوں اور قلب کے متنوع واردات کے آئینہ دار ہیں۔ غالبؔ کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے اردو میں نئے اسالیب پیدا کیے اور اظہارِ خیال کے ممکنات کی ایک نئی دنیا آراستہ کر کے رکھ دی۔ اس کے لیے مثالیں درکار ہیں، لیکن میں یہاں مثالیں نہیں دے سکتا۔ اقبالؔ کو شاعری میں مجتہدِ مطلق کا درجہ حاصل ہے مگر اردو میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ غالبؔ کے ایجاد کردہ اسالیب کو دیکھ کر ہی لکھا۔ غالبؔ کے کمالات کا اندازہ کرنا ہو تو کسی ایک موضوع پر اشعار جمع کر لیجیے اور پھر اس کی ندرت کاریاں دیکھیے مثلاً شراب پر اس کے فارسی اور اردو کلام میں دو تین سو شعر ضرور ہوں گے مگر ہر شعر کا انداز اور مضمون نیا ہے اور عرق نوشی کے لذت شناس جانتے ہیں کہ ہر شعر ایک خاص حقیقت و واقفیت کا آئینہ دار ہے، نرا خیال ہی نہیں۔ میرے خیال میں غالبؔ کے ان اشعار کی مثالیں کہیں اور نہیں مل سکتیں:-

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے شانے پہ تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی

مرحوم جسٹس کیانی صاحب کو سب سے پہلے میں نے ان دنوں دیکھا جب دو ججوں پر مشتمل ایک کمیشن ۱۹۵۳ء کے "انٹی احمدیہ حادثات" اور ہنگاموں کی عدالتی تحقیقات کر رہا تھا۔ اس کمیشن کے ایک ممبر مرحوم جسٹس کیانی تھے۔ اس وقت اس عدالتی تحقیقات کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ میں ان دنوں ایم۔ اے علومِ اسلامیہ کا طالب علم تھا۔ پروفیسروں سے آنکھ بچا کر کھسک جاتا اور عدالت کی تمام کارروائی باقاعدگی سے سنتا۔ کمیشن کے دوسرے ممبر جسٹس منیر تھے۔ عدالت میں پیش ہونے والوں پر زیادہ تر سوالات وہی کرتے تھے۔ کیانی صاحب کبھی کبھار کوئی بات پوچھ لیتے۔ ان کی آواز دھیمی ہونے کی وجہ سے بہت کم سنائی دیتی تھی۔ اس لیے میں ان کی آواز پر بہت ہی کم متوجّہ ہوتا، تاہم اگر کبھی ان کی آواز کان میں پڑ گئی، تو مجھے اس سے اکثر یہ احساس ہُوا کہ کیانی صاحب بہت گہرا اور ٹیڑھا سوال کرتے ہیں۔

انہی دنوں میری ملاقات میرے ایک پرانے مشفق دوست سے ہوئی۔ وہ بھی اکثر عدالت میں آیا کرتے تھے۔ عدالتی تحقیقات کے بارے میں گفتگو چل نکلی۔ انہوں نے اپنے مُنہ کو میرے کان کے قریب لاتے

ہوئے آہستہ سے کہا :

"تم نے دیکھا؟ جسٹس کیانی اکثر اپنے ہونٹوں کو چباتے رہتے ہیں۔ یہ ان کے جذباتی ہونے کی علامت ہے۔۔ اور ویسے بھی کمزور و نحیف لوگ بے حد جذباتی ہوتے ہیں۔"

میرے ذہن نے غیر شعوری طور پر اس تاثر کو قبول کر لیا اور میں پانچ چھ سال تک جسٹس کیانی مرحوم کو ایک جذباتی انسان سمجھتا رہا۔ جذباتی انسان بہت کم پسند کیے جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اگرچہ میں خود ایک جذباتی انسان ہوں، لیکن مجھے اپنے سوا دوسرے جذباتی لوگوں سے کچھ نفرت سی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کچھ کر گزرنے کے لیے جذباتی ہونا ضروری سا ہے، جہاں جذبات کی گرم گرم رَو غور و فکر کے سرد خانے میں جذب ہو کر رہ جائے وہاں بھرپور عمل کی تحریک کیا خاک پیدا ہو گی۔

بہرحال مجھ میں پانچ چھ برس تک کیانی صاحب کے خلاف ناپسندیدگی کا جذبہ پرورش پاتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام سن اٹھاون رکھا گیا۔ میں ان دنوں ایم۔اے سیاسیات کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ "دستورِ پاکستان" ہمارے نصاب میں داخل تھا۔ ایک روز میں کتابوں کی دکان پر کتابیں تلاش کر رہا تھا کہ میری نظر ایم شفقت کی کتاب "دستورِ پاکستان" پر جم کر رہ گئی۔ میں نے اس کے اوراق اُلٹے پلٹے، کتاب پسند آئی اور اُسے خرید لیا۔ ان دنوں میرا معمول تھا کہ گھر سے صبح چھ بجے نکلتا اور رات کے دس گیارہ بجے واپس آتا۔ اس روز بھی گھر گیارہ بجے پہنچا لیکن خریدی ہوئی نئی کتاب کو پڑھنے کے شوق نے مجھے رات بھر جگائے رکھا۔ اس کتاب کا مقدمہ جسٹس کیانی نے لکھا تھا۔ میں نے اس مقدمے کو بار بار پڑھا اور ہر بار اسے ختم کر لینے کے بعد پھر سے پڑھنا شروع کر دیتا۔

علم، مشاہدے اور تجربے کی سہ رنگی کرنیں دلآویز امتزاج کے ساتھ ان صفحات میں جذب تھیں۔ زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں مجھے پتہ چلا کہ یوں دریا کو کوزے میں بند کیا کرتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کا جائزہ لیتے ہوئے کیانی صاحب نے کبھی تاریخ کے سمندر میں غوطہ لگایا اور تہہ میں سے دو چار موتی نکال لائے۔ کہیں الفاظ کے آبگینوں سے

ایسا شیش محل" تیار کیا کہ "عروسِ دستور" کی گہری اور جا اور بیجا میک اپ اس طرح عیاں ہو گئی کہ دیکھنے والے زیرِ لب مسکرا دیئے اور کبھی قانونی اور دستوری حسِ لطیف سے کام لیتے ہوئے منہ بنا کر کہہ دیا کہ "کچھ چیزیں بیٹر رہی ہیں۔"

غالباً یہ کیانی صاحب تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس آمریت پر بھرپور وار کیا جس نے کچھ عرصہ بعد ہی قوم کی دستوری آزادی کا پروانہ بیک جنبش چاک کر کے رکھ دیا لیکن قوم کی بنا کے کھیون ہار اس وقت کچھ اس طرح محوِ خواب تھے کہ انہیں نہ کچھ سنائی دیا اور نہ کچھ دکھائی دیا اور اسی "خفیہ ہاتھ" نے جو پہلے "رکھوالیوں" کو نشہ آور گولیاں کھلاتا رہا، موقع پا کر آدھی رات کی مدہوشیوں میں ان کا گلا آدبوچا اور ان کی بے بسی اور بے کسی کی چیخیں ان کے حلق میں اٹک کر رہ گئیں۔

اس "مقدمے" کو پڑھ کر جسٹس کیانی صاحب کے بارے میں میرے خیالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ مجھے اب یوں محسوس ہونے لگا کہ اس نحیف جسم میں ایک عظیم شخصیت جلوہ گر ہے جو مستقبل قریب میں ظہور پذیر ہونے والی ہے۔

مَیں نے اپنے اس وجدانی تاثر کا ذکر اپنے ہم جماعتوں سے کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے:

"قریشی صاحب، تم ہمیشہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ بھلا کیانی صاحب کی شخصیت میں کیا عظمت پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے پچپن سالوں میں کوئی چونکا دینے والا کام نہیں کیا تو اب وہ کیا کر دکھائیں گے۔"

مَیں خاموش ہو رہا۔ انہیں مَیں کیا سمجھاتا کہ کیانی صاحب کی تحریر ایک آنے والے عظیم انقلاب کا پتہ دے رہی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے سیاسی حالات غیر یقینی کی کہر میں گم ہو گئے۔ مارشل لاء ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ عوام خوش تھے لیکن ملک کے باشعور حلقوں میں تشویش و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مارشل لاء کا دور ایک قوم کے لیے سب سے زیادہ کٹھن آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اس عہد کی ذرا سی بے احتیاطی ایسے اثرات چھوڑ جاتی ہے جس کو زائل کرنا آنے والی نسلوں کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ملک کے دانشور سخت مضطرب تھے لیکن

اضطراب کو اپنے اظہار کے لیے راستہ نہیں ملتا تھا اور بوجھ سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ کچھ کہنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب سے زیادہ تشویش کا پہلو یہ تھا کہ دیانتدارانہ مشوروں اور بے لاگ تنقیدوں کی غیر موجودگی میں مارشل لاء کے ارباب اقتدار ان خوشامدیوں کے ریشمی جال میں نہ پھنس جائیں جن کی جی حضوری، حقائق پر دبیز پردے ڈال کر اصحاب مقتدر کو اندھا اور بہرہ بنا دیا کرتی ہے اور جس کے نتیجے میں ان سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں جو قوم کی تباہی اور ان کے اپنے زوال کا باعث بنتے ہیں۔

ملک کے ہر بہی خواہ کی یہ آرزو تھی کہ یہ تشویش بے بنیاد ثابت ہو لیکن قومی تاریخ کے اس نازک خطرے کا سدِّباب صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا تھا کہ ایک طرف ہلکے پھلکے، مزاحیہ اور شگفتہ انداز میں حکمرانوں کو صحیح مشورے دئے جائیں، ان کی لغزشوں پر بالواسطہ اور غیر محسوس تنقید کی جائے تاکہ اقتدار کی پیشانی پر خشمگیں اور انتقام آمیز شکنیں بھی نہ پڑیں اور اس کے قدم بھی سنبھلے رہیں۔ دوسری طرف عوام کے رُکے رُکے اور بوجھل جذبات، بجھے بجھے اور ٹھٹھرے احساسات میں مسکراہٹوں کی لطافتیں اور تازگیاں بھر دی جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جذبات کے ہر آن بڑھتے ہوئے گیس کی تاب نہ لاتے ہوئے غبارے کی طرح پھٹ جائیں یا مایوسیوں کی دلدل میں دھنس کر رہ جائیں، لیکن اس نازک کام کے لیے بے پناہ جرأت و استقامت، تہہ تک پہنچ جانے والی بصارت اور سلیقے سے بات کہنے کی صلاحیت، غیر معمولی شگفتگی اور ذہانت اور سب سے بڑھ کر ملک سے والہانہ محبت اور شیفتگی کی ضرورت تھی۔ قوم کی آنکھیں، مایوسی اور اضطراب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کسی ایک ایسی شخصیت کی راہ تک رہی تھیں جس میں یہ خصوصیات موجود ہوں اور جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے میدان میں سربکف نکل آئے۔

اسی کامل سکوت کے عالم میں کسی کے ادھورے قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور ساتھ ہی الفاظ کے پھول برسنے لگے۔ غور سے دیکھا تو کچھ پھولوں کی پتّیوں میں ننھے ننھے خار پنہاں تھے لیکن لطف یہ تھا کہ جن کے سینوں میں ان کانٹوں کی نوکیں پیوست ہو گئی تھیں وہ بھی مسکرا اٹھے اور جن سریع الحس حضرات نے خلش کو کچھ

زیادہ ہی محسوس کیا وہ بھی صرف کسمسا کر رہ گئے۔

یہ ادھورے قہقہے اور الفاظ کے پھول جسٹس کیانی کی طرف سے آئے تھے۔

ابھی جسٹس کیانی کی دو تین ہی تقریریں فضا میں لہرائی تھیں کہ ایک صاحب سے ان کے سٹائل پر بات ہوئی۔ کہنے لگے:

"ان کی تقریروں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ چند چٹکلے اور زیادہ تر لفظوں کا ہیر پھیر۔ صرف لفظوں کو اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔"

مَیں نے ان سے کہا:

"اتنا تو سوچو، یہ شخص اس وقت بول رہا ہے جب سب خاموش ہیں۔" مگر انہوں نے سوچنے سے انکار کر دیا۔

جسٹس کیانی صاحب کی شخصیت دو تین سالوں میں کافی ابھر چکی تھی۔ ایک دن مَیں نے انہیں فون کیا کہ مَیں آپ سے انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔

ان کی باریک اور ٹھہری ہوئی آواز آئی:

"ابھی نہیں، ابھی وقت نہیں آیا۔ جب وقت آ جائے گا مَیں تمہیں خود بُلا لوں گا۔"

مَیں اصرار کرتا رہا اور وہ پہلو بچاتے رہے۔ بالآخر مَیں نے صحافت کا تُرپ کا پتہ پھینکتے ہوئے ان سے کہا:

"کیانی صاحب، ہم قوم کے سامنے ان مسائل کا حل رکھنا چاہتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اس ضمن میں آپ پر بھاری ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، کیا آپ ہم سے تعاون نہیں کریں گے؟"

ان کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ کہنے لگے: "اچھا پھر کسی وقت فون کر لیجئے۔"

مارچ ۱۹۶۲ء کی اکیس تاریخ تھی۔ بدھ کا دن تھا۔ مَیں نے کیانی صاحب کے سیکرٹری کو فون کیا اور

انہوں نے کیانی صاحب سے بات کرنے کے بعد جواب دیا:

"آج ہی آجائیے پورے ایک بجے۔"

"آج ہی!" مَیں نے عالمِ حیرت میں پوچھا۔

"جی ہاں، کیانی صاحب نے آج ہی کا وقت دیا ہے۔"

اس وقت بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ مَیں نے جلد جلد ذہن میں کچھ سوالات مرتّب کیے اور اپنے دو دوستوں ظفر اللہ خاں صاحب اور فضل الدین سیّد صاحب کی معیت میں ہائی کورٹ جا پہنچا۔ چیف جسٹس کیانی صاحب اپنے کمرے میں تھے۔ ہمیں فوراً بلا لیا گیا۔ جس وقت ہم داخل ہوئے، وہ نیم استراحت کی حالت میں کرسی میں دھنسے ہوئے تھے۔ ہمارے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھ پر ایک لمحے کے لیے بھرپور نگاہ ڈالی اور چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ کو پھیلاتے ہوئے کہا:

"اچھا، آپ ہیں الطاف قریشی!"

مَیں نے کہا:

"جی ہاں ــ" مگر مجھے حیرت تھی کہ انہیں یہ کیسے احساس ہُوا کہ مَیں الطاف قریشی ہوں، حالانکہ وہ مجھے اس سے پہلے بالکل نہیں جانتے تھے۔ وہ ہمیں بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"فرمائیے، مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ ٹھہریے، آپ میرے الفاظ کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لیجئے۔ اکثر حضرات مجھ پر یہی ظلم کرتے ہیں۔ خدمت سے میری مراد وہ خدمت نہیں ہے جو ضرورت مند اپنا جائز بالعموم ناجائز کام کروا لینے سے پہلے یا اس کے بعد اہلکاروں کی کیا کرتے ہیں۔"

ہم مسکرا دیے لیکن کیانی صاحب کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ مَیں نے جواب میں رُکتے رُکتے کہا:

"آپ سے کچھ سُننے آئے ہیں اور کچھ کہنے آئے ہیں شاید اس طرح دل کا غم کم ہو جائے۔"

"کیسا غمِ دل؟" انہوں نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

"وہی جس کی ٹیسیں آپ کو دن رات مضطرب رکھتی ہیں۔"

کیانی صاحب نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا:

"دل کی بات کہنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے لیے بہت کچھ اہتمام کرنا پڑتا ہے کتنی ہی تمہیدیں اٹھانی پڑتی ہیں اور پھر بھی حرفِ مدعا لب نا آشنا ہی رہتا ہے اور ہاں یہ شعر سُنا آپ نے ؏

کون سنتا تھا حدیثِ غمِ دل یوں تو مگر

ہم نے چھیڑی ہے تیرے نام سے تمہید اب کے

ہائی کورٹ کی خاموشی اور تقدس آمیز فضا میں یہ شعر جذب ہو گیا، لیکن دلوں میں ایک ہنگامہ برپا کر گیا۔ ایک لمحے کے لیے پھر خاموشی طاری ہو گئی۔

مَیں نے سکوت توڑتے ہوئے کیانی صاحب سے سوال کیا:

"اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعات بتائیے۔"

کیانی صاحب نے جواب میں کہا:

"میرا خیال ہے کہ آپ میری زندگی کی خشک اور غیر دلچسپ روداد شائع کر کے اپنے قارئین کو بور نہ کیجیے۔ بھلا ایک عام آدمی کو اس بات میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ مَیں کہاں اور کب پیدا ہُوا۔ کہاں کہاں تعلیم پائی، کن کن نازیبا حرکتوں کا مرتکب ہوتا رہا۔ مجھے اس قسم کی باتوں سے کوفت ہوتی ہے۔"

وہ پھر رُک گئے اور قدرے توقّف کے بعد کہنے لگے:

"کچھ دن ہوئے میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا۔ مَیں طالب علموں کے خطوط بڑے اہتمام سے پڑھتا ہوں اور ان کا جواب بھی خاص اہتمام سے دیتا ہوں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ مجھے بتایا جائے کہ ایم۔ آر۔ کیانی کا کیا مطلب ہے۔ مَیں نے جواب میں لکھا۔ میرا پورا نام محمد رستم ہے۔ صرف نام کا رستم ہوں جسم کا

نہیں" بس قریشی صاحب میرے متعلق اتنا ہی جان لینا کافی ہے۔"

جونہی یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے، مجھے ایک بھولا ہؤا واقعہ یاد آ گیا۔ جسٹس کیانی صاحب کی کوٹھی میں ایک چور گھس آیا۔ کیانی صاحب کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اسے اس مضبوطی سے پکڑا کہ وہ اپنے آپ کو کیانی صاحب کی گرفت سے آزاد نہ کروا سکا۔ اس لاغر انسان کے جسم میں نامعلوم کونسی قوّت چھپی ہوئی تھی جس نے اس کی گرفت کو اتنا سخت بنا دیا تھا۔ یقینی طور پر یہ مضبوط قوّتِ ارادی کا کرشمہ تھا اور اسی کی بدولت وہ متعدّد جان لیوا بیماریوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

"کیانی صاحب!" میں نے موضوع کو بدلتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کا محبوب مشغلہ (ہابی) کیا ہے؟"

"باغبانی"۔ انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولے:

"باغبانی سے مجھے بچپن ہی سے لگاؤ ہے۔ سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہو جاؤں گا، پھولوں کی کیاریاں بناؤں گا۔ ان میں رنگ برنگ پھول ہوں گے جو مشامِ جاں کو معطّر کرتے رہیں گے۔ جب بڑا ہؤا تو ایک کیاری بنائی۔ اس میں مختلف پھولوں کے بیج ڈالے۔ ایک بھی بار آور نہ ہؤا۔ ایک مرتبہ اپنے ذوق کے مطابق چھوٹا سا باغیچہ بنایا، مگر جب پھولوں کے کھلنے کا موسم آیا تو میرا تبادلہ ہو گیا اور ایک بار یوں ہؤا کہ مجھے ایک ایسی کوٹھی مل گئی جس میں باغیچہ میری پسند کا تھا لیکن چند ہی دنوں میں میں نے اسے اجاڑ دیا۔ میں ایسی باغبانی کرتا ہوں۔"

کیانی صاحب اتنا کہہ کر کرسی پر دراز ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ کیانی صاحب ان لفظوں میں ان باغبانوں کی داستان بیان کر گئے ہیں جنہوں نے باغیچۂ پاکستان کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

میرے ایک ساتھی نے نہایت ہی اہم مسئلے پر سوال کیا:

"کیانی صاحب، یہ ہمارا بگڑا ہؤا معاشرہ کس طرح سدھر سکتا ہے؟" کیانی صاحب کے جسم میں دفعتہً ایک حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کرسی پر سیدھے بیٹھ گئے اور قدرے بلند آواز میں کہنے لگے:

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، معاشرے میں بگاڑ کے کیا معنی — اور اگر کسی جگہ بگاڑ ہے تو وہ معاشرہ

نہیں۔ معاشرہ تو نام ہی لوگوں کے اس اجتماع کا ہے جس میں نظم ہو، مقصد ہو اور ہم آہنگی ہو ۔۔۔ دس بارہ سال سے پاکستان میں کچھ بگاڑ پیدا ہو رہا تھا لیکن مارشل لاء کے نفاذ کے بعد حالات بالکل ٹھیک ہو گئے۔"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے بات کاٹی۔

"غالباً میرے ساتھی کی مراد ہماری اخلاقی پستی سے ہے۔"

"اخلاقی پستی" انہوں نے یہ الفاظ دہرا کر ایک لمحے کے لیے خلا میں گھورا اور پھر کہنے لگے:

"اخلاقی اقدار کی پابندی کسی خوف کے بغیر ممکن نہیں۔ مجھے ایک نہایت ہی ذمہ دار شخص نے بتایا کہ ۴۷ء میں جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے، تو وہ پاکستان کی دو نہایت ہی قیمتی چیزیں "کنفیڈنشل بکس" میں بند کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیں اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ یہ بات سن کر مجھے پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی اور مَیں نے رازدارانہ انداز میں اس ذمے دار شخص سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیا چیزیں تھیں؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرا شوقِ تجسس اور بڑھ گیا۔ مَیں اس کے اور قریب آگیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے راز بتا دینے کی استدعا کی۔ اس نے کہا کہ انگریز "خدا اور آخرت کا خوف اور قانون کا احترام اپنے ساتھ لے گئے۔" یہ سن کر مَیں نے اپنے دل کو ٹٹولا، وہ ان دونوں چیزوں سے خالی تھا۔"

ان کی آنکھوں میں گداز کے سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے تھے۔ آواز کو درست کرتے ہوئے انہوں نے گفتگو کو جاری رکھا۔

"میرا بھتیجا ایک ایسی فرم میں کام کرتا ہے، جہاں والے نیالے ہیں لیکن وہ "غیر عورت" کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا کہ تم اتنے "بزدل" اور "احمق" کیوں ہو؟ بہتی گنگا میں کیوں اشنان نہیں کرتے؟ میرے بھتیجے نے جواب دیا کہ مَیں نے اپنے چچا سے عہد کیا ہُوا ہے کہ جو کچھ کروں گا، صحیح صحیح بتا دوں گا۔ اب اگر مَیں رشوت لے لوں تو انہیں بتانا پڑے گا۔ مجھے ان کی ناراضگی سے خوف آتا ہے۔"

"مگر مجھے آپ صحافیوں سے خوف آ رہا ہے ۔۔۔۔" وہ یہ کہہ کر مسکرا دیے اور پھر خاموش ہو گئے۔"

میرے ساتھی ظفراللہ خاں صاحب نے سوال کیا:

"آپ ریٹائر ہونے کے بعد کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

انہوں نے برجستہ جواب دیا:

"جو کچھ پہلے کرتا آیا ہوں۔ زخم کھا کر مسکرا دینا۔ اب یہ دعا کیجئے کہ زخم لگانے والے ہاتھ زندہ رہیں، ورنہ میری مسکراہٹوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ دراصل ریٹائر ہونے کے بعد مَیں انہی ہاتھوں کو تلاش کرنے نکلوں گا——"

معلوم نہیں غالب کا یہ شعر کیوں یاد آ رہا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

"نئے دستور کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟" مَیں نے پُرجوش آواز میں سوال کیا۔

"یہ سوال آپ دستور سازوں سے پوچھیئے۔ ہم ججوں کا ان باتوں سے کیا سروکار۔ جج صاحبان رائے نہیں دے سکتے وہ تو——"

یہ فقرہ انہوں نے نامکمل ہی چھوڑ دیا۔ شاید اس لیے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مگر مَیں نے سوچا جس دیس میں انسانوں کے کان نہیں ہیں وہاں دیواروں کے کان کہاں ہوں گے۔

میرے دوسرے ساتھی فضل الدین سید صاحب نے سوال کیا:

"آپ نے تقریر و تحریر کا یہ تیکھا انداز اور لطیف پیرایہ کن سرچشموں سے حاصل کیا؟"

وہ مسکرائے اور ہونٹوں کو چھوتی ہوئی ناک کو سکیڑتے ہوئے کہنے لگے: "یہ آپ لوگوں اپنی نکتہ رس اور نکتہ سنج نظر ہے جس نے میری سیدھی سادی باتوں کو خاص رنگ دے دیا ہے۔ مَیں تو صرف جو کچھ دیکھتا ہوں اسے بیان کر دیتا ہوں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ زندگی کے افق پر جب کوئی الجھاؤ ابھرتا ہے مَیں اس کا مشاہدہ کرتا ہوں اور الجھے ہوئے دھاگوں کا سرا ڈھونڈنے کے لیے ماضی کی طرف چل نکلتا ہوں۔ پُرپیچ پگڈنڈیوں پر چلتا رہتا

ہوں یہاں تک کہ سراغ جاتا ہے کبھی نہیں بھی ملتا۔"

"ان پگڈنڈیوں پر سے واپس آنے میں کوئی دقت تو پیش نہیں آتی۔" فضل صاحب نے بے تکلفی کے عالم میں پوچھا۔ "نہیں، کوئی دقت نہیں ہوتی، جیسے جاتا ہوں ویسے ہی لوٹ آتا ہوں۔ مجھے اس کی کافی مشق ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کئی سالوں سے سی ایس پی آفیسرز کی ایسوسی ایشن کا صدر رہوں اور مجھے اس حیثیت میں تقریریں کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ ڈنر پر سنجیدہ، پھیکی پھیکی اور بار بار کی دہرائی ہوئی باتیں کہنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا اس لیے میں کوشش کرتا کہ کوئی نئی بات کہوں اور ہنستے ہنساتے کہوں۔"

دو بج چکے تھے اور کیانی صاحب کو سوا دو بجے ایک ضروری میٹنگ میں شریک ہونا تھا۔ ہمارا انٹرویو ابھی نامکمل تھا۔ میں ان سے درخواست کی کہ کوئی اور وقت دیجیے۔ کہنے لگے:

"سب سے زیادہ موزوں وقت تو ریٹائر ہونے کے بعد کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے پاس کافی فارغ وقت ہوگا۔ پھر مجھے کون ملنے آئے گا۔ یہ سب اس عہدے کے جھمیلے ہیں۔"

میں نے کہا: "میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کے پاس اتنا وقت بھی نہ ہوگا جتنا اب آپ مجھے دے سکتے ہیں۔ آپ قریب ہی کا کوئی وقت مقرر کر دیجیے۔"

"اچھا، پھر فون کر لینا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم ان کے اور بھی قریب ہو گئے۔ اب میں ان کے نقش و نگار کو بہت واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ ان کی پیشانی کی کشادگی سلوٹوں میں گم تھی۔ کان غیر معمولی طور پر بڑے تھے جو سننے کے علاوہ سوچتے بھی ہیں۔ آنکھیں گہری اور مشاہدے میں ڈوب جانے والی تھیں۔ ان کی لمبی اور جھکی ہوئی ناک ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی آئینہ دار تھی۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے کیانی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: "سنا ہے آپ اپنی تقریریں چھپوانا چاہتے ہیں، ہمیں دے دیجیے، ہم انہیں آپ کے ذوق اور مذاق کے مطابق شائع کریں گے۔"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر سر اٹھاتے ہوئے کہا:

"مَیں آپ کی پیش کش پر غور کروں گا۔ مجھے ناشرین پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں۔ یہ لوگ کتاب زیادہ چھاپ لیتے ہیں لیکن مصنّف کو تعداد کم بتاتے ہیں۔ بیچارے مصنّف کے لیے ہر کتاب پر نگاہ رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس سے ذہنی کوفت بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"ان میں ایسے ناشر بھی ہیں جن کے قول پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔" مَیں نے کیانی صاحب کے تاثر کی شدّت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"کب تک شائع کروانے کا ارادہ ہے؟" میرے ساتھی نے مزید استفسار کیا۔

"ابھی اس میں کچھ دیر لگے گی۔ مَیں نے اپنی تقریروں کے مجموعے پر صدر محترم ایّوب صاحب سے دیباچہ لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مَیں نے جناب قدرت اللہ شہاب صاحب سے درخواست کی ہے کہ جب صدر صاحب کو فراغت ہو اور ان کا موڈ شگفتہ ہو تو اُن سے کچھ لکھوا لیجئے۔"

ہم مسکرا دیئے۔

کیانی صاحب نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "جس سے بھی اس کا تذکرہ کرتا ہوں وہ مسکرا دیتا ہے اور جب مَیں نے ایوب صاحب سے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔ حیران ہوں کہ اس میں مسکرانے کی کونسی بات ہے؟"

ہم پھر مسکرا دیے اور انہی مسکراہٹوں کے ساتھ کیانی صاحب سے رخصت ہوئے۔

اِس کے بعد مَیں کچھ اس طرح مصروف ہو گیا کہ کیانی صاحب سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ دو تین ماہ کے بعد مَیں نے انہیں ایک خط لکھا جس میں ان سے کم از کم دو گھنٹے انٹرویو کے لیے نکال لینے کی درخواست کی تھی۔ نے جواب دیا: "یہ تو مَیں سمندری جہاز میں بند اگر آپ کو مل سکوں کہ سوائے باتوں کے چارہ نہ ہو، تو ممکن ہے۔"

ستمبر کے وسط میں مَیں نے کیانی مرحوم کو ایبٹ آباد فون کیا۔ ان سے ڈائجسٹ کے سالنامے کے لیے

مضمون لینا تھا۔ انہوں نے میری استدعا کے جواب میں کہا:

"قریشی صاحب! آپ کا رسالہ بہت اچھا ہو گیا ہے، مگر مَیں اس رسالے کے معیار کا کوئی کارنامہ اپنی زندگی میں نہیں پاتا۔"

مَیں نے اصرار کرتے ہوئے کہا:

"آپ کچھ بھی لکھ بھیجیے، وہی چیز ہمارے لیے قابلِ قدر اور تاریخی ہو گی۔"

انہوں نے لکھنے کا وعدہ فرمایا۔

"آپ کا انٹرویو بھی تو ادھورا ہے۔"

"مَیں ۳۰۔ ستمبر کو لاہور پہنچ رہا ہوں۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں انٹرویو بھی لے لیجیے۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ کب چراغ بُجھ جائے۔"

۵۔ اکتوبر کو مَیں نے گیانی مرحوم کو فون کیا۔ کہنے لگے:

"آدمی بھیج دیجئے، تاکہ ادھورا مضمون لے جائے۔"

"اور انٹرویو؟"

"بھئی بہت مصروف ہوں۔ چند دن اور ٹھہر جائیے۔"

اُن کا مضمون آیا۔ مضمون کے آخری فقرے یہ تھے:

> "اپنی اہمیت کا احساس تو کئی دفعہ ہُوا ہے۔ زندگی کا کچھ نہیں سوچا۔ جب تک ہے تو ہے، اس کی اہمیت بھی ہے۔ جب نہ ہو گی تو اہمیت بھی ساتھ لے جائے گی۔ کچھ دن چراغ جلے گا۔ کچھ دن پُھول بچھائے جائیں گے۔ پھر اس کے بعد حسرتوں کی وادیاں ہزار نامرادیاں۔"

ان فقروں کو پڑھ کر بے اختیار دل بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

۱۸ر اکتوبر ۶۲ء کو اہالیانِ لاہور نے باغِ جناح میں کیانی صاحب کو "تاریخی دعوت" دی کیانی صاحب نے لاہور کے شہریوں کے ساتھ بے تکلف باتیں کیں اور اسی رات میں نے انہیں فون کیا:

"موزوں وقت آگیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجیے"

"اب تو میں کچھ دنوں کے لیے لاہور سے باہر جا رہا ہوں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر زندہ رہا تو واپسی پر آپ کو ضرور انٹرویو دوں گا۔"

لیکن وعدہ پورا ہونے تک زندگی نے وفا نہ کی۔

۱۵ر نومبر کو جب کیانی صاحب کی موت کی خبر فضا میں پھیلی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ ساری کائنات لرز اٹھی ہے۔ درد شعروں میں ڈھلتا چلا گیا اور یہ غزل تاروں سے باتیں کرتے کرتے موزوں ہو گئی۔

خزاں میں بہاروں کے پیغام لائے   شگفتہ اشارے، اچھوتے کنائے
فقط موت کی خامشی توڑنی تھی !   کہیں ہنس دیے ہم، کہیں گنگنائے
ہمیں عشق نے جب بھی آواز دی ہے   بڑے بانکپن سے سرِ دار آئے
یہ خونِ جگر تھا کہ جس کی بدولت   خزاں دیدہ گلشن میں رنگ لوٹ آئے
چمن، آہ ان کے تصرّف میں آیا !   چٹک جن کو بھائے نہ بُو راس آئے
جنوں کی حکایات لکھتے رہے ہم   بالآخر اسی راہ میں کام آئے !

کوئی ایسی لغزش ہو الطاف جس سے
مشیّت کا ٹھہراؤ جنبش میں آئے !

جسٹس محمد شریف

پچھلے دنوں طلبہ کے ہنگاموں نے جو ہمہ گیر اور سنگین صورت اختیار کر لی تھی، اس نے اربابِ فہم و دانش کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ ہنگامے کیوں ہو رہے ہیں؟ ان کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ ان کی کس طرح روک تھام کی جائے؟ یہ چند سوالات تھے جو بار بار ذہنی افق پر ابھرتے، تشویش و اضطراب کی لہریں اٹھاتے اور پھر خود ہی ان لہروں میں گم ہو جاتے۔ مرحوم حمید نظامی صاحب نے ان ہنگاموں کا اصل سبب "حبسِ دم" بتایا تھا۔ کچھ کے نزدیک ان ہنگاموں کے پسِ پردہ چند تخریبی قوتیں کام کر رہی تھیں۔ ایک طبقے کی رائے میں یہ سب کچھ نئی تعلیمی اصلاحات کے خلاف ردِّ عمل تھا۔ میرا ذہن کثرتِ وجوہ و اسباب میں الجھ کر رہ گیا۔ پہلے سوچا کہ نفسیات کے اس فارمولے کو آزمایا جائے کہ جس مسئلے سے ذہنی الجھن پیدا ہو، اسے بالکل فراموش کر دیا جائے، لیکن مسئلہ اتنا نازک اور اہم تھا کہ اس سے صرفِ نظر کرنا بہت سے خطرناک نتائج کو دعوت دینا تھا۔ خیال آیا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جسٹس محمد شریف صاحب سے کیوں نہ رہنمائی حاصل کی جائے۔ وہ قانونی ذہن رکھتے ہیں، اس لیے ان کے نتائجِ فکر نہایت ہی

صحیح، متوازن اور نپے تلے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ان سے رابطہ پیدا کیا اور انہوں نے بلا تامّل وقت دے دیا۔

جس جگہ پر سعید سہگل کا قصرِ جمیل اپنے بے مثل حسن و رعنائی کے ساتھ ایستادہ ہے، اس سے ذرا ہٹ کر کچّی روش پر جسٹس صاحب کا بنگلہ ہے۔ ہم نے وائس چانسلر صاحب کو نہایت ہی سادہ کپڑوں میں ملبوس برآمدے میں بیٹھا ہوا پایا۔ وہ ہم سے پُرتپاک انداز میں ملے اور ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو جسٹس صاحب نے سگریٹ پیش کیے۔ ہم تینوں (ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، امین اللہ وثیر اور راقم الحروف) دھوئیں کے مرغولے بنانے کی لذّت سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور پھر مختلف موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔

ان سے تقریباً چار گھنٹے باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں ان کی زندگی کے گوناگوں پہلو اور گوشے سامنے آئے۔ وہ ستر چھتّر کے پیٹے میں ہیں، لیکن کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا جذبہ اب بھی جوان ہے۔ چہرے مہرے سے متانت ٹپکتی ہے اور باتوں میں فراست اور ذہانت کا عنصر موجود ہے۔ انہوں نے قانون کا اچھا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ قرآن حکیم اور اسلامی لٹریچر پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ انہیں بے پناہ محبت ہے، ایسے اسلام کے ساتھ جو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور رجحانات کا ساتھ دے سکے۔

سادگی، ہنگامہ آرائی سے اجتناب اور مشرقیت سے گہری وابستگی ان کے کردار کی متمائز خصوصیات ہیں۔ اگرچہ انہوں نے زندگی کے سفر کا آغاز ایک متوسط خاندان سے کیا اور سفر کے دوران میں کتنی ہی بلندیوں کو چھُوا۔ شوق اور آرزوؤں کے کئی نگارخانوں سے گزرے، لیکن وہ اپنی وضع پر قائم رہے اور ان کے سادہ طور و طریق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب ان کی زندگی کے واقعات پر نظر دوڑاتا ہوں تو قدرت کی بخشائشوں اور فیاضیوں کی فراوانی کے احساس سے زبان پر بے اختیار شکر کے کلمات آجاتے ہیں۔

سوچنے لگتا ہوں کہ واقعی اس کے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ جب بندہ پروری پر آتا ہے تو بے حد و حساب دیتا ہے اور دینے کی راہیں بھی خود ہی نکال لیتا ہے۔ جسٹس شریف قسمت کے سکندر ہیں، ایسے سکندر جنہیں ہر چیز بن مانگے ملی ہے۔ میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ ابھی تک گونج رہے ہیں — "قریشی صاحب، میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ میرا یہ کام کر دیجئے۔"

اُن کے اِن الفاظ سے جہاں ان کی عظمت اور خودداری ٹپکتی ہے، وہاں ان کی بے نیازی اور خوش بختی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

پندرہ بیس منٹ تک اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شریف صاحب نے گفتگو کا رخ خود ہی انٹرویو کی طرف پھیر دیا۔

"جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھ لیجئے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس بتانے والی کوئی بات نہیں ہے اور مجھے سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ میں لوگوں کی توجہ کا مرکز اس وقت بنا ہوں، جب میں سفرِ حیات کی آخری منزل میں ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ جسٹس صاحب سے یہ کون کہے کہ عمر کا یہی حصّہ تو حاصلِ زیست ہے۔

میں نے جسٹس صاحب سے ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں استفسار کیا۔ جواب میں کہنے لگے:

"میری زندگی ایک عام انسان کی زندگی ہے۔ میں ۱۸۹۳ء میں جالندھر کے ایک متوسّط گھرانے میں پیدا ہُوا۔ میری جائے پیدائش گوجرانوالہ ہے لیکن زندگی کا بڑا حصّہ جالندھر میں گزرا۔ بی اے ایل ایل بی۔ کرنے کے بعد جالندھر میں وکالت شروع کی۔ اپنے عہدِ وکالت کا مجھے ایک مقدمہ سب سے زیادہ یاد ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ان دنوں مرحوم سیّد عطاء اللہ بخاری کو حکومت نے اس بنا پر گرفتار کیا تھا کہ انہوں نے مرزا بشیر الدین (جماعت احمدیہ) کے خلاف سخت باتیں کہی تھیں۔ احرار کے چند سر کردہ لیڈر

میرے پاس آئے اور انہوں نے سنگین صورتِ حال میرے سامنے رکھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں نے اس مقدمے کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا تو کچھ بے گناہوں کو قید و بند اور شاید دار و رسن کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ میں نے اس تاریخی مقدمے کی پیروی کا فیصلہ کر لیا اور خدا کے فضل و کرم سے میں اس مقدمے میں کامیاب رہا۔ عدالت کے اندر اور باہر سمٹے ہوئے ہجوم کے جوش و خروش کے روح آفرین مناظر آج تک میرے ذہن میں اس طرح تازہ ہیں جیسے یہ کل ہی کی بات ہے، حالانکہ ایک زمانہ بیت گیا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے!

یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء کو مجھے ہائیکورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے شروع میں مجھے دہلی بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو مملکتِ پاکستان کے نئے آئینی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا کام شروع ہونا تھا اور مجھے بھی اس میں کام کرنا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں یہ کام ہوتا رہا۔

پاکستان بنا تو میں لاہور آ گیا۔ دس بارہ سال مقدمات سننے اور ان کا فیصلہ سنانے میں گزر گئے۔ ۱۹۵۷ء میں مجھے اسلامی قانون کمیشن کا چیئرمین بنا دیا گیا، جسے مروّجہ قوانین کو قرآن اور سنّت کے مطابق ڈھالنے کا کام کرنا تھا۔ قبل ازیں سپریم کورٹ کا جج بنایا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ایبڈو کمیٹی کا چیئرمین مقرر ہوا اور اس سے فراغت پائے ابھی دو تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ میرے بوڑھے کندھوں پر پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی گراں ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ سوچتا ہوں کہ کیا زندگی مسلسل کام کا دوسرا نام ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں، لیکن شاید آرام میرے مقدر میں نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں کام کرنے میں ایک نوع کی راحت اور آرام محسوس کرتا ہوں۔"

جب جسٹس صاحب کتابِ زندگی کے اوراق پلٹ چکے تو میں نے ضمناً ایک سوال پوچھا:

"آپ نے ابھی بتایا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے سلسلے میں قائدِ اعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کے دستور کے بارے میں

قائدِ اعظم کے احساسات و جذبات کیا تھے؟"

جسٹس صاحب نے فوراً جواب دیا:

"مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ذہن میں پاکستان کے دستور کا کیا خاکہ تھا۔ مجھے اُن سے اِس موضوع پر تفصیلی گفتگو کا کبھی موقع نہیں ملا۔"

"جسٹس صاحب، آپ کے خیال میں تحریکِ پاکستان کے پیچھے کون سے مقاصد کار فرما تھے؟ اسے کسی واضح نظریے کی قوت نے جنم دیا تھا یا اس کے محرّک چند وقتی مسائل اور کچھ معاشی تقاضے تھے؟" مَیں نے ایک اور سوال داغ دیا۔

جسٹس صاحب کے ہونٹوں پر الفاظ کھیل رہے تھے۔ وہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر ہمارے کانوں کے پردوں کو چھُو رہے تھے۔ ان کا مفہوم یہ تھا:

"مَیں نے خود تحریکِ پاکستان میں کام کیا ہے۔ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس میں مَیں بھی شامل تھا۔ جہاں تک مَیں سمجھ سکا ہوں تحریکِ پاکستان کے پیچھے متعدد عوامل کام کر رہے تھے اور اگرچہ ان میں معاشی، لسانی اور معاشرتی عوامل بھی شامل تھے لیکن سب سے زیادہ مضبوط اور انقلاب آفرین اسلام کی قوت تھی جس نے برِصغیر پاک و ہند کے بکھرے ہوئے اور نہتّے مسلمانوں کو ایک ناقابلِ تسخیر قوت بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقِ پاکستان میں نصرتِ ایزدی شامل تھی ورنہ اتنا عظیم کام اتنی کم مدّت میں کبھی تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاں تک ہمارے سیاست دانوں کا تعلّق ہے، وہ پاکستان کے قیام کے بعد پیدا ہونے والے حالات و نتائج سے بڑی حد تک خالی الذہن تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں میری ملاقات لیاقت علی خاں مرحوم سے ہوئی۔ ان دنوں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اتنے وسیع پیمانے پر کشت و خون کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

"جسٹس صاحب، تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جو اسلامی نظام

کو قائم کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ اس نظریے کو ذہنوں میں زیادہ سے زیادہ راسخ کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں؟"

جب مَیں یہ سوال کر رہا تھا، اس وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی معلوم نہیں کیوں؟

جسٹس صاحب نے معمول کے مطابق بلا تامّل جواب دینا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سوال کے لیے وہ پہلے ہی سے تیار تھے، وہ کہہ رہے تھے:

"میرے نزدیک کسی نظریے اور نظام کو زندگی میں رائج کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ افراد بالخصوص با اثر افراد — اپنی زندگیوں کو اس انداز سے ڈھالیں کہ وہ اس نظریے کی جیتی جاگتی تفسیر بن جائیں۔ اسلام عمل سے پھیلا ہے، مسلمانوں کی پاکیزہ اور بے داغ سیرت قلب و ذہن کی اقلیم کو مسخر کرتی رہی ہیں۔ ہندوستان کے ظلمت کدے میں صوفیائے کرام اور مبلّغین نے ایمان والیقان کی قندیلیں روشن کیں۔ ملایا اور انڈونیشیا میں عرب تاجروں کی دیانت داری، سچائی اور وعدہ ایفائی کے اوصاف نے وہاں کے باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ سرزمینِ افریقہ میں اسلام کی آمد اور اس کا فروغ بھی تاجروں اور مبلّغین کی مساعیِ جمیلہ کی بدولت ہُوا۔ غیر مسلم اسلام کو ضخیم جلدوں میں تلاش نہیں کیا کرتے، بلکہ مسلمانوں کی زندگیوں سے اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ میرا اس بات پر کامل یقین ہے کہ جب تک اسلام با اثر افراد کی زندگیوں میں نہیں جھلکے گا، اس وقت تک صرف تقریروں اور زبانی طور پر اسلام کو شاندار خراجِ تحسین ادا کرنے سے کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔

اسلام کے نظریۂ حیات کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے نظامِ تعلیم بھی ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا بلند اور پاکیزہ کردار، اچھی کتابوں کا انتخاب اور اخلاقی تربیت کا مؤثر نظام، نوجوان طلبہ میں ایک نہایت ہی عمدہ کردار ابھار سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر مسرت کن ہے کہ ثانوی درجے تک اسلامیات کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔

جونہی نظامِ تعلیم پر گفتگو کا آغاز ہوا، میرے ذہن میں لاتعداد سوالات رینگنے لگے۔ کچھ تو اس لیے کہ موضوع ہی اہم تھا اور زیادہ تر اس لیے کہ میرے مخاطب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ایک ایسی یونیورسٹی کے، جس کے ساتھ قوم کی کتنی ہی امیدیں وابستہ ہیں اور جس نے علم و تحقیق کے میدان میں نئی نئی راہیں تلاش کی ہیں۔ یہ ایک ایسی دانش گاہ ہے جس کے تجربات پوری قوم کی ذہنی، فکری اور علمی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ مَیں نے جرأت کر کے وائس چانسلر صاحب سے ایک نہایت ہی گستاخ سوال کر ڈالا۔

"جسٹس صاحب، اگر آپ مجھے معاف فرمائیں تو عرض کروں کہ یونیورسٹی کے موجودہ نظامِ تعلیم میں ایک بنیادی نقص موجود ہے۔ یہاں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان میں لادینیت کی روح جاری و ساری ہے۔ انہیں پڑھ کر خدا، انسان اور کائنات کے متعلّق وہ تصوّر نہیں ابھرتا جو اسلام ہمیں دیتا ہے اور نہ ہی ان کے مطالعے سے ان گرانقدر خدمات کا کوئی احساس ہوتا ہے جو مسلمانوں نے علم و تحقیق اور سائنس و طب کے میدانوں میں سرانجام دی ہیں۔ مثال کے طور پر علم السیاسیات کے مضمون کو لے لیجیے۔ ایم اے میں اس مضمون کو جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے، اس سے بجا طور پر صرف یہ تاثّر پیدا ہوتا ہے کہ اس علم میں یا تو اہلِ یونان نے کچھ کام کیا ہے یا پھر حکمائے مغرب کی ذہنی تخلیقات نے اس کے دامن کو وسعت بخشی ہے۔ مسلمانوں کا کہیں ذکر نہیں آتا، حالانکہ انہوں نے اس علم میں گرانقدر کام کیا ہے۔ اسی طرح اسلام کا نظریۂ سیاست اور تصوّرِ ریاست بحث سے خارج رہتا ہے، حالانکہ پاکستان میں اس نظریے کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے حالات میں علومِ اسلامیہ کا علیحدہ شعبہ اس لادینیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کو نہیں روک سکتا جو دوسرے مضامین پیدا کر رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمام مضامین ذہن کو ایک ہی تاثر دیں اور تمام نظامِ تعلیم کے پیچھے ایک مربوط فکری نظام کارفرما ہو؟"

جسٹس صاحب میرے اس طویل سوال کو تحمّل کے ساتھ سنتے رہے، لیکن ان کا ذہن اضطراب کے عالم میں پہلو بدلتا رہا۔ وہ درمیان میں کچھ کہنا چاہتے، مگر پھر رک جاتے۔ جب مَیں بات ختم کر چکا، تو

وائس چانسلر صاحب نے اپنی بات شروع کی:

''آپ کی باتیں بڑی حد تک صحیح ہیں، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کا سائنس، جغرافیہ اور طب کے میدانوں میں کونسا ایسا بڑا حصّہ ہے جسے نصاب میں شامل کیا جائے۔ صدیاں گزر گئیں اور مسلمانوں نے انسانی علوم میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا۔ میں خود چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے علمی کارناموں کا احیاء کیا جائے، لیکن ہمیں ایسے اہلِ علم و فضل نہیں ملتے جو جدید عصری تقاضوں کے مطابق تصنیف و تالیف کا کام کرسکیں۔ آخر کتابوں کے بغیر تبدیلی کیسے ممکن ہے۔

علومِ اسلامیہ کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس مضمون میں بنیادی اہمیت قرآن حکیم کو حاصل ہونی چاہیے۔ قرآن کا فہم جتنا زیادہ بڑھے گا، ہم اسلام کے اتنا ہی قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہمارے مطالعے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ قرآن حکیم، جو ہماری ہدایت کا سرچشمہ ہے، اس سے ہم براہِ راست استفادہ نہیں کرتے اور فقہی مسائل کی باریکیوں میں الجھے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم میرے نزدیک علم الحیاتیات یا علم النباتات کی کتاب نہیں، یہ زندگی کا مکمل ہدایت نامہ ہے۔ ہمیں ہدایت کے لیے اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔''

اسلام اور قرآن کے متعلق جسٹس صاحب کے خیالات نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ فی الواقع اگر ہم قرآن حکیم کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالنا شروع کردیں تو ایک عظیم انقلاب ابھر آئے لیکن پھر وہی سوال بار بار اٹھتا ہے کہ جب ہمارا پورا معاشرہ، ہمارے دانشور اور ہمارے بااثر حلقے اپنی زندگیوں میں سے اسلام کے اثرات مٹاتے چلے جارہے ہیں، اور نئی پود کے لیے قرآن کی تعلیم کا کوئی معقول اور اچھا انتظام نہیں، تو پھر اسلام کی فرماں روائی کیسے قائم ہو۔ آج عالم یہ ہے کہ جب مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو ''مسلمان'' ہوٹل والا ریڈیو کی آواز بلند کردیتا ہے کہ کہیں لتا کے نغمے اذان کے الفاظ میں دب کر نہ رہ جائیں۔

میرا ذہن سوچ بچار کے اسی دھارے پر بہہ رہا تھا کہ جسٹس صاحب نے بات کو آگے بڑھاتے
ئے کہا:۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ عبادات پر زور دیتے ہوئے معاملات کی اہمیت کو کیوں نظر انداز
ر جاتے ہیں، حالانکہ میرے نزدیک عبادات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ افراد کو اس بات کے لیے پوری
ح تیار کیا جائے کہ وہ معاملات کو دیانت داری، خوش اسلوبی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کریں۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک بھکارن آئی اور اس نے مخصوص لہجے میں
لنا شروع کر دیا۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ جسٹس صاحب بھکارن سے کہہ رہے تھے:

"جاؤ، جاؤ، ہمیں کام کرنے دو۔"

مگر بھکارن ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جسٹس صاحب برابر چلے جانے کے لیے کہہ رہے تھے اور وہ
بر سوال کیے جا رہی تھی کہ شاید دونوں جہان لے کر بھی وہ خوش نہ ہو۔ اس منظر نے میرے راہوارِ فکر کو
ے مہمیز لگائی۔ بارِ خدا! یہ کیا ہے! ہمارے ملک نے صنعتی اور زرعی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔
ین عمارتیں اور پرشکوہ بنگلے تعمیر ہو گئے ہیں۔ سڑکیں کشادہ اور باغات پُر فضا ہیں، لیکن گداگری کا مکروہ چہرہ
ماں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ بھکاریوں اور بھیک منگتوں کا ملک ہے۔
ن کی آواز میں کتنا درد اور سوز ہوتا ہے۔ ہاتھ خود بخود جیب کی طرف جاتا ہے۔ ہمدردی اور رحم کا جذبہ
س انسان میں نہیں ہوتا۔ جب ایک بھکاری آپ سے یہ کہتا ہے: "مجھے صرف دو آنے دے دیں
ودن سے بھوکا ہوں۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے" تو آپ دو آنے اس کی طرف بڑھا دیتے ہیں اور یہ توقع
کھتے ہیں کہ اب وہ کسی اور کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کرے گا، لیکن دوسرے ہی لمحے ۔۔ یہی الفاظ
پھر فضا میں گونجتے ہیں اور آپ اپنی سادہ لوحی اور حماقت پر افسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ وہ بھکاری، قوم کی
ذلت، بے عملی اور بے غیرتی میں اضافہ کیے چلا جاتا ہے۔

خدا خدا کر کے وہ بھکارن وہاں سے ٹلی۔ ہمیں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا کہ ہم کس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے جسٹس صاحب سے ایک نیا سوال کیا:

"یونیورسٹی نے مختلف قسم کے لوگوں کو پرائیویٹ طور پر امتحانات میں بیٹھنے کی سہولتیں دے رکھی ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا ان سہولتوں کو باقی رہنا چاہیے؟"

وائس چانسلر صاحب نے جواب میں فرمایا:

"میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ پرائیویٹ طور پر امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت باقی رہنی چاہیے۔ اس میں آخر کیا حرج ہے۔ اگر کچھ لوگ ملازمت میں رہتے ہوئے اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کی کوشش کریں۔ بلکہ یہ تو ایک خوش آئند علامت ہے۔ اگر قوم کے افراد معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔"

وائس چانسلر صاحب جس مشفقانہ انداز میں ہمارے سوالات کا جواب دے رہے تھے، اس نے ہمیں اچھا خاصا بے باک بنا دیا تھا۔ جسٹس صاحب سے باتیں کرتے وقت ہم کچھ یوں محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہم ہی میں سے ہیں اور وہ ایسا دل رکھتے ہیں جو عوامی جذبات کی حلاوت سے لذت یاب ہے۔

میں نے ایک اور سوال کیا:

"یونیورسٹی کا مخلوط نظامِ تعلیم کیا کئی معاشرتی پیچیدگیوں اور انتظامی الجھنوں کو جنم نہیں دے رہا ہے اور کیا اسے بدل دینے کی فوری ضرورت نہیں ہے؟"

جسٹس صاحب نے، جن کے سر پر چاندی ایسے سفید بال ان کی پختگیٔ عمر، بالغ نظر اور تجربات کی وسعت کا پتہ دے رہے تھے، نہایت واضح الفاظ میں کہا:

"میں ذاتی طور پر مخلوط نظامِ تعلیم کو سوسائٹی کے لیے سخت مضر سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ایک بے معنی سی بات ہے کہ جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جمع ہوں اور انہیں ایک دوسرے کے قریب

آنے کے مواقع ملیں، وہاں لباس کی کانٹ چھانٹ اور چمک دمک پر پابندی عائد کر دی جائے۔ ان پابندیوں سے قطعاً کوئی اچھے اور مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ نوجوان لڑکی کو جب بھی نوجوان لڑکے کے سامنے آنے کا موقع ملے گا، وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اپنے حُسن کی نمائش کرے گی۔ اس لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ ان دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا جائے۔ موجودہ حالات میں عملی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ لاہور میں خواتین کے جو کالج ہیں وہ ایم اے کی کلاسوں کا بھی اہتمام کریں۔ ان انتظامات سے ان کے اخراجات میں اضافہ ضرور ہو جائے گا، لیکن اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اقدار کی بقا اور حفاظت کے لیے کچھ قربانی دینا ہی پڑتی ہے اور شاید قوم میں سے ایسے مخیّر حضرات نکل آئیں جو کالجوں کو مالی امداد دے کر ان کا بوجھ ہلکا کر دیں۔ ان انتظامات کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں موجودہ نظامِ تعلیم بھی قائم رہے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ کتنے والدین ہیں جو اپنی بچیوں کو خواتین کے کالجوں میں بھیجتے ہیں اور کتنے والدین ہیں جو اپنی بچیوں کے لیے مخلوط نظامِ تعلیم پسند کرتے ہیں۔"

جسٹس صاحب کے ان خیالات کو سُن کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ خوشی اس لیے کہ ان کے یہ خیالات ایک اسلامی ذہن کے آئینہ دار تھے اور حیرت اس لیے کہ جسٹس صاحب اتنے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کے باوجود خواتین کے بارے میں اب بھی "دقیانوسی" خیالات رکھتے ہیں۔ یہ باتیں تو کسی "مولوی" کو زیب دیتی ہیں۔ روشن خیالی اور آزادئ نسواں کے اس ترقی پسند عہد میں مخلوط نظامِ تعلیم کو سوسائٹی کے لیے ضرر رساں قرار دینا کتنی حیرت انگیز بات ہے۔ آجکل مشاہدے میں تو یہ آتا ہے کہ جہاں کسی صاحبِ کو دولت اور عہدہ میسّر آیا، ان کی بیگم ایک دم چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بنیں، حجاب کے پردے اٹھتے چلے گئے، پارٹیوں کی روحِ رواں قرار پائیں اور ان کے خرامِ ناز سے ثقافت، آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے "الحمراء" وجود میں آنے لگے۔

نظامِ تعلیم پر کئی سوالات کر چکا تھا، خیال آیا کہ ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ دریافت کر لوں جو

نظامِ تعلیم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے تعاون کے بغیر ایک اچھے سے اچھا تعلیمی نظامِ تعلیم بھی کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

مَیں نے وائس چانسلر صاحب سے استفسار کیا:

"آپ اساتذہ کی عمومی فلاح و بہبود اور ان کی معاشی خوش حالی اور معاشرتی بلندی کے لیے کیا اقدامات ضروری سمجھتے ہیں؟"

جسٹس صاحب نے بے ساختہ جواب دیا:

"ہم اپنے اساتذہ کی تنخواہوں میں پہلے ہی سے اضافہ کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کے کام کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ جہاں تک انہیں معاشرے میں عزت و احترام کا مقام دینے کا مسئلہ ہے تو اس کے لیے حکومت، اساتذہ اور عوام کو مل جل کر کام کرنا پڑے گا۔ حکومت سروسز کی اس طرح تنظیمِ نو کرے کہ اساتذہ کو وہ انتظامی حیثیت حاصل ہو جائے جو انتظامی EXECUTIVE افسران کو حاصل ہوتی ہے۔ اساتذہ اس سلسلے میں یہ کر سکتے ہیں کہ وہ زیادہ ذمہ داری، فرض شناسی اور محنت سے کام کریں اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے چلے جائیں۔ ہمارے اساتذہ کا غیر ذمہ دارانہ رویہ اور ان کے پست طور و طریق، ان کی معاشرتی تذلیل کا بہت بڑا سبب بنے ہیں۔ عوام کا یہ فرض ہے کہ وہ اساتذہ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھیں اور یہ سمجھیں کہ اساتذہ اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں سے ان کے بچوں کے ذہن و فکر کی آبیاری کرتے ہیں اور یہ کام اتنا نازک اور اتنا بیش قیمت ہے کہ اس کا معاوضہ ادا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میرے خیال میں ایک بچے کے کردار کی تشکیل میں استاد کا کردار، والدین کے کردار سے کہیں زیادہ اہم اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔"

تعلیم کا موضوع کافی طویل ہو گیا تھا۔ مَیں نے موضوع کو بدلتے ہوئے اسلام کے نظامِ قانون پر جسٹس صاحب سے سوال کیا:

"آپ کے خیال میں اسلام کا نظامِ تعزیرات ملک میں نافذ کیا جا سکتا ہے؟"

جسٹس صاحب کچھ دیر کے لیے رُکے، ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگے:

"اسلام کا تعزیراتی نظام نافذ کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے لیے دو باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اوّل یہ کہ اسلام کے تعزیراتی نظام کو جدید خطوط پر مدوّن کیا جائے۔ علماء اور فقہاء میں سزاؤں کے بارے میں شدید اختلافات ہیں اور سزا کا معاملہ اتنا نازک اور اہم ہے کہ اس میں اختلاف کی گنجائش بہت ہی کم ہے، کیونکہ کسی انسانی زندگی کو تکلیف پہنچانا یا اسے بالکل ختم کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے قانونی حس رکھنے والے لوگ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور ایک ایسا تعزیراتی نظام ترتیب دیں جو ایک طرف قرآن کی روح کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو اور دوسری طرف اس میں معاشرت و تمدّن کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہو۔ لیکن یہ کام بے حد مشکل ہے، کیونکہ اختلافات اتنے زیادہ اور ایسی بنیادی نوعیت کے ہیں کہ انہیں دُور نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر زناء کی سزا کو ہی لے لیجئے۔ علماء کے ایک طبقے کے نزدیک شادی شدہ زانی کی سزا رجم (پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا) ہے، لیکن قرآن میں صرف سو کوڑوں کی سزا کا ذکر ہے، اس لیے میرے نزدیک یہی سزا جائز اور درست ہے۔ احادیث سے رجم کی سزا بھی ثابت ہے، لیکن میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ حدیث، قرآن کی کسی سزا میں کمی یا زیادتی کر سکتی ہے۔

تعزیراتی نظام کے نفاذ میں ہمیں تدریج کا خاص خیال رکھنا پڑے گا۔ تدریج کے بغیر موجودہ معاشرے میں اسلامی قانون کو نافذ کر دینا سخت نقصان دہ ثابت ہوگا۔"

"اسلام کے بارے میں ایک اصولی بات بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ اصول و مبادی کا منبع و مرجع قرآن حکیم ہے۔ اگر اس میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے تو پھر ہم اپنے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے قیاس سے کام لیں گے۔ میرے نزدیک فقہا کے فیصلے ہمیں صحیح نتائج تک پہنچنے میں مدد تو دے

سکتے ہیں لیکن انہیں ہر سوسائٹی اور ہر معاشرے کے لیے آخری فیصلہ سمجھ لینا غلطی ہے۔ قانون کا فیصلہ ہمیشہ دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر عدالت کے کیے ہوئے ایک فیصلے کے خلاف کوئی بہتر دلیل سامنے آجاتی ہے تو جج پہلے فیصلے کو منسوخ قرار دے دیتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں صدیوں سے جمود طاری ہے۔ قرآن سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کی بجائے دینی مدرسوں میں زیادہ وقت فقہ کی کتابوں پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس ناقص نظامِ تعلیم نے ذہنوں کو محدود اور جامد بنا دیا ہے۔"

جسٹس صاحب ایک ہی سانس میں کئی چونکا دینے والی باتیں کہہ گئے تھے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ علماء کو دینی مدارس کے نصاب پر فوراً نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ واقعی وہاں قرآن اور حدیث کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو فقہ، منطق اور فلسفے کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کو یہ بھی محسوس کر لینا چاہیے کہ ان کے غلط طرزِ عمل سے ذہین طبقوں میں کیسے رجحانات ابھر رہے ہیں۔ ہمارا فقہی ذخیرہ جس طرح منتشر اور غیر مرتب ہے، وہ سلجھے ہوئے ذہنوں کو یقیناً پریشان کرتا ہوگا۔ اگر علماء کی سہل انگاری، ان کی غیر معتدل روش اور تنگ دامانی کی وجہ سے سمجھ دار اور صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ اسلام سے دور ہوتا چلا گیا تو اس کی ساری ذمہ داری ان پر آئے گی اور خدا ان کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

مَیں انہی خیالات میں غلطاں تھا کہ جسٹس صاحب کے یہ الفاظ سطحِ ذہن پر رینگنے لگے: "قانون کا فیصلہ دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔" مَیں چند لمحوں کے لیے ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس سوچ نے ایک نئے سوال کو جنم دیا۔ مَیں جسٹس صاحب سے مخاطب ہوا:

"انسانی قانون کے متعلق تو یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کا فیصلہ صرف — دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یعنی ایک جج فیصلہ دیتے وقت صرف یہ دیکھے گا کہ کونسی دلیل بہتر ہے، لیکن اسلامی قانون میں دلیل کے ساتھ ساتھ دلیل دینے والے کے کردار کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک مفاد پرست قانون دان اپنی

ذہانت کے بل بوتے پر قانون کی ایک ایسی تعبیر کرنے میں کامیاب ہوجائے جو بظاہر زیادہ صحیح نظر آئے لیکن اس کا مقصد ایک خاص مفاد کا تحفظ ہو۔

انہی امکانات کے پیشِ نظر اجتہاد کے لیے جہاں فہم و فراست اور دینی علوم میں گہری نگاہ درکار ہے، وہاں بے داغ سیرت اور پاکیزہ کردار بھی بیحد ناگزیر ہے۔"

جسٹس صاحب نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور جوش کے عالم میں فرمانے لگے:

"لیکن کسی کے کردار کے متعلق آپ رائے کیسے قائم کریں گے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ جو بظاہر بہت متدین نظر آتے ہیں، ان کے معاملات کا معیار نہایت ہی گھٹیا ہوتا ہے۔"

مَیں نے بات کو آخری مرحلے تک پہنچاتے ہوئے کہا:

"جسٹس صاحب، قوم میں دو چار افراد ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے خلوصِ نیت، دیانت اور پاکبازی کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں۔"

جسٹس صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

"لیکن اب تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔"

مَیں خاموش ہوگیا۔ لیکن ذہن یہ بات قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا کہ پوری قوم میں اب ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جس کی دیانت اور امانت پر اعتماد کیا جاسکے۔

مَیں موضوع بدل دینا چاہتا تھا، لیکن فضا کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ہر بات پھر وہی رنگ اختیار کرلیتی۔ مَیں نے اس موضوع سے بہت دور ہٹ کر سوال کیا:

"کیا آپ کو کسی بیرونی ملک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"جی ہاں — صرف ایک بار۔" انہوں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

"بھئی مَیں گھر سے باہر نکلنا بہت ہی کم پسند کرتا ہوں۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ مَیں زیادہ دوڑ دھوپ

پسند نہیں کرتا بلکہ ہر کام کو آرام اور سکون سے کرنے کا عادی ہوں۔ ایک بار نائیجیریا کی حکومت نے مجھے قانونی مشورے کے لیے بلایا تھا۔ چونکہ ادھر سے اصرار زیادہ تھا اور کام کی نوعیت میرے نزدیک کافی اہم تھی، اس لیے میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دن نائیجیریا میں رہنے کے بعد انگلستان چلا گیا، لیکن وہاں میری طبیعت نہ لگی، اس لیے میں دو چار دن ہی ٹھہر کر واپس اپنے ملک چلا آیا۔ مجھے زندگی کے جھمیلوں سے کوئی زیادہ لگاؤ نہیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: یہ بھی قدرت کی عجب ستم ظریفی ہے کہ جو زندگی کے جھمیلوں سے دور بھاگتا ہے، زندگی اس کے قدموں کو چومتی ہے اور جو ان کے لیے شب و روز سرگرداں رہتا ہے، ان سے وہ اتنی دور رہتی ہے جتنا مشرق کے محب سے اس کا محبوب۔

جسٹس صاحب کبھی کبھار پنجابی بھی بول لیتے ہیں، بڑی ہی مٹھاس ہے اس بولی میں۔ فوراً خیال آیا کہ اردو زبان کے بارے میں جسٹس صاحب کے خیالات معلوم کیے جائیں۔ خیال آتے ہی میں نے سوال کر ڈالا:

"جسٹس صاحب، آپ کے خیال میں پاکستان میں اردو زبان کی کیا حیثیت ہونی چاہیے؟"

جسٹس صاحب نے فرمایا:

"اس معاملے میں اب دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ ہمیں اس کی ترقی و ترویج کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے جب تک ہمارا ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہوگا تعلیمی معیار اونچا نہیں ہو سکتا۔ یونیورسٹی کی طرف سے ہم نے ترجمہ اور تالیف کا کام شروع کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میدان میں تیزی سے کام کیا جائے تاکہ ہم جلد سے جلد ذریعۂ تدریس کو بدل سکیں۔ میرے نزدیک سائنس کے مضامین کے لیے بھی انگریزی زبان ضروری نہیں۔ روس نے سائنس کے میدان میں جو اتنی ترقی کی ہے، کیا وہ انگریزی زبان کی مرہونِ منت ہے؟ ہم اپنی قومی زبان میں سائنس پڑھ کر زیادہ سے زیادہ تخلیقی اور تحقیقی کام کر سکتے ہیں۔"

"یہ کتنے صاف اور سلجھے ہوئے خیالات ہیں" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اب اردو زبان کے بڑھتے

ہوئے سیلاب کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اب جو قوت بھی اسے روکنے کے لیے اٹھے گی، اس کے لیے اب شکست اور پسپائی مقدر ہو چکی ہے۔"

"آپ کے خیال میں اسلام کو سب سے زیادہ خطرہ کس طبقے سے لاحق ہے؟"

جسٹس صاحب نے بلا تامل کہا:

"مولویوں سے۔"

"یہ حضرات عصری تقاضوں سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے پیشِ نظر حصولِ اقتدار ہے۔ وہ عوام میں جذباتی لہریں اٹھاتے رہتے ہیں۔ ان کا کردار بھی عام طور پر پست ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ان کے جامد خیالات سے ذرا سا اختلاف کرتا ہے، وہ ملعون و مطعون قرار پاتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ نتیجۃً اسلام عملی زندگی سے خارج ہوتا جا رہا ہے۔"

جسٹس صاحب کے جذبات نکتۂ عروج پر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں مولویوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت موجود ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ عین ممکن ہے کہ ان کی بعض شکایات صحیح ہوں لیکن اس مسئلے کا یہ پہلو گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے:

"ہمارے ملک میں دینی تعلیم کا جو ناقص نظام موجود ہے اور ہمارے معاشرے میں عالمِ دین کی جو قدر و منزلت ہے اور ہم معاشرتی زندگی میں اسے جو مقام دیتے ہیں اور ہماری سوسائٹی کی اخلاقی سطح جس قدر پست ہے ان کی موجودگی میں آئیڈیل اور بلند کردار علماء کہاں سے پیدا ہوں؟ ان کی نظر میں وسعت اور ان کے علم میں گہرائی کہاں سے آئے؟ اگر علماء علم و اخلاق کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں ہوتے تو اس میں یقیناً پوری قوم کا قصور ہے اور شاید علماء اس لیے بھی کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کہ وہ اسلام کی چند روایات کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔ وہ ہر نئی تہذیب کی برائیوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ نہیں اور شاید ان کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ اسلام کو ہر نئے فیشن کے مطابق تراشنے کیلئے تیار نہیں۔"

چودھری محمد علی

پاکستان جن مخدوش حالات میں صفحۂ ہستی پر اُبھرا، ان کے پیشِ نظر دشمن یہ اندازے لگائے بیٹھے تھے کہ یہ نوزائیدہ ملک انتظامی بدنظمی، وسائل کی کمی اور بے ڈھنگی جغرافیائی تقسیم کے باعث چند مہینوں سے زائد اپنے آپ کو قائم نہ رکھ سکے گا لیکن نصرتِ ایزدی، مخلص سربراہوں اور کارکنوں کے جوشِ عمل اور عام مسلمانوں کے جذبۂ تعاون نے ان "اندازوں" کو غلط ثابت کر کے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ پاکستان، قیام کی راہوں سے گزر کر ترقی کی منزلوں کی طرف رواں دواں تھا اور یہ امید بندھ گئی تھی کہ چند ہی سالوں میں اس سرزمین سے ایک نئی سیاسی زندگی کا "پودا" پھوٹے گا جو محبانِ وطن کا خونِ جگر پی کر جلد ہی ایک تنومند درخت بن جائے گا جس کی جڑیں اتنی گہری ہوں گی کہ بادِ مخالف کا کوئی بھی طوفان اسے گزند نہ پہنچا سکے گا۔

یہ امیدیں ایک عرصے کے لیے حسرتوں کے ناسور بن کر رہ گئیں۔ وہ ہاتھ ہم سے چھن گئے جنہوں نے سیاسی فضا کو تابناک بنانے کے لیے شب و روز کام کیا تھا۔ آمریت کے سائے بڑھتے گئے اور جمہوریت سمٹتی چلی گئی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جمہوریت دم توڑتے توڑتے رہ گئی۔ دستور ساز اسمبلی کو کام کرنے سے روک دیا گیا اور ملک

میں خوف و ہراس پھیلا کر ایک "نیم جان" اپنی مرضی کو نافذ کرنے پر تُلا ہُوا تھا۔ قوم کم ہمتی اور بے حسی کے باعث دم سادھے ہوئے تھی اور یوں نظر آتا تھا کہ آمریت کا ہاتھ جمہوریت کا گلا گھونٹنے کے لیے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔

اِس عالمِ مایوسی میں کئی مہینے بیت گئے۔ تمیز الدین خاں صاحب کی جراَتِ رندانہ نے ماحول کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں حرکت کی لہریں پیدا کیں۔ دوسری طرف جمہوریت پسند عناصر نے "اندر ہی اندر" اپنی مساعی کو جاری رکھا اور بالآخر ایک نئی دستور ساز اسمبلی وجود میں آئی۔ ادھر سیاست کی زلفِ پیچ در پیچ نے اپنے روایتی انداز میں پرانے عاشق کے دل کو جھٹک کر ایک طرف پھینک دیا اور کسی "نئے شکار" کو گرفتار کرنے کے لیے ہر سُو دام پھیلا دیے، کئی مشتاقانِ جمال آگے بڑھے لیکن کوئی اور ہی "پیرِ مغاں" دام میں آگیا۔ چودھری محمد علی صاحب کے سر پر وزارتِ عظمیٰ کا کانٹوں بھرا تاج رکھ دیا گیا۔

اس وقت صورتِ حال نہایت ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما تھی۔ قوم دستور کے لیے مضطرب تھی لیکن بے شمار چھوٹے اور بڑے سیاسی، معاشی اور علاقائی اختلافات نے دستور سازی کے کام کو پہلے سے بھی زیادہ مشکل بنا دیا تھا۔ چودھری محمد علی طوفانوں اور گردابوں سے بچتے بچاتے دستور کی کشتی کو ساحلِ مراد تک لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کی صبح پاکستان کے افق پر ایک نئی دلربائی اور حیات آفرینی کے ساتھ طلوع ہوئی۔ دس سال کے شدید انتظار کے بعد آج قوم کو دستور ملا تھا اور پاکستان نے پہلی بار ایک آزاد اسلامی ریاست کا روپ دھارا تھا۔ آج کی شام نور و نکہت میں ڈوبی ہوئی تھی اور عوام کا جوش و خروش اظہار کے تمام پیکر توڑ چکا تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے:

"ایک محمد علی (جناح) نے ہمیں پاکستان عطا کیا اور دوسرے (چودھری) محمد علی نے ملک میں دستور نافذ کیا ہے۔ ہم ان دونوں شخصیتوں کے احسانات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔"

آج اہلِ پاکستان واقعی مسرتوں اور خوشیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، ان کے دل والہانہ خودرفتگیوں، بے تابانہ وارفتگیوں اور پُرجوش امنگوں کا محشرستان بنے ہوئے تھے۔ ایک عجیب منظر تھا۔ ایسا منظر جس کو دیکھنے کے لیے اب آنکھیں ترس گئی ہیں۔

چودھری محمد علی صاحب، وزارتِ عظمیٰ کے خار زار میں زیادہ دُور تک نہ چل سکے اور وہ وہاں سے نکل آئے۔ کچھ سرگوشیاں سننے میں آئیں کہ چودھری صاحب منجھے ہوئے سیاست دانوں کے ہاتھوں مات کھا گئے ہیں، لیکن اس سلسلے میں عوام کے تاثرات بالکل ہی مختلف تھے۔ دھڑکتے ہوئے دل کہہ رہے تھے:

"شرافت، اسلام دوستی اور اصول پسندی شکست کھا گئی ہے۔ دیکھئے اقتدار پرست اور بے اصول ٹولے ملک کی کیا حالت بناتے ہیں۔"

مجھے خود چودھری صاحب کی کئی باتوں سے اختلاف تھا لیکن قیامِ پاکستان کے بعد نظم و نسق کو قائم کرنے اور اسے بہتر بنانے میں انہوں نے جو شاندار خدمات انجام دی تھیں اور اب "اصولوں" کی خاطر اقتدار کو چھوڑ دینے کی جو قابلِ رشک مثال قائم کی تھی، ان سب باتوں نے میرے دل میں چودھری صاحب کے لیے عزت اور احترام کے جذبات پیدا کر دیے۔ اس کے علاوہ چونکہ میں نے بہت سے ممالک کے دساتیر کا مطالعہ کیا تھا اور ۱۹۵۶ء کے دستور کے بارے میں اپنے کچھ جدا تاثرات اور تجاویز رکھتا تھا اس لیے میری دلی خواہش تھی کہ چودھری صاحب سے تفصیلی گفتگو کی جائے لیکن برسوں تک یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اپنے دیس میں "بڑے آدمیوں" سے ملنا کچھ آسان نہیں، خصوصاً اس وقت جب حکومت ان پر سایہ فگن ہو۔ "عوام کے خادم" عوام سے دُور رہتے ہیں، شاید اس لیے کہ عوام میں گھلنے ملنے سے وہ کہیں "عام" نہ ہو جائیں۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں چودھری صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو عام سے آدمی ہیں، ان میں کوئی "بڑا پن" نہیں۔ ایک عام آدمی کی طرح باتیں کرتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، دوسرے کی بات بڑے تحمل سے سنتے ہیں اور ایک استاد کی طرح اپنی بات ذہن نشین کروانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا لباس سادہ سادہ

شلوار اور شیروانی، طور و اطوار بھلے مانسوں کے سے، نگاہوں میں خلوص اور شفقت کے تیرتے ہوئے جذبات، اور پیشانی پر محنت، فراست اور وسعتِ مطالعہ کے گہرے نقوش ـــ یقین نہ آتا تھا کہ سادگی کا یہ پیکر کبھی مسندِ اقتدار پر بھی بیٹھا ہوگا۔

"مجھے آپ سے انٹرویو لینا ہے۔" مَیں نے جھجک کو خیرباد کہتے ہوئے کہا۔

"نومبر کے بعد۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پھر انہوں نے اردو ڈائجسٹ کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا:

"مَیں آپ کا رسالہ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، بالخصوص آپ کی "شخصیتوں" کو۔ ان میں سب سے منفرد بات یہ ہوتی ہے کہ آپ شخصیت کو مرکز بنانے کی بجائے مسائل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے انگریزی رسائل کا یہ انداز پسند نہیں کہ "وہ شخصیت" کی ذات کو ضرورت سے زیادہ پھیلا دیتے ہیں۔ آپ ایک مفید کام کر رہے ہیں۔"

مَیں ان سے "وعدۂ فردا" لے کر اٹھا۔ ہم "وعدۂ فردا" پر ہی تو جیتے ہیں۔

۱۵ر دسمبر کی شام کو چھ بجے، روشنی میں نہائی ہوئی مال روڈ سے گزرتا ہوا مَیں "واپڈا" کے خوبصورت فلیٹس کے سامنے کھڑا تھا۔ چودھری صاحب ان دنوں یہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔

چودھری صاحب نے بیٹھتے ہی پوچھا:

"قریشی صاحب، چائے پئیں گے؟"

اگرچہ خاصی سردی تھی لیکن چودھری صاحب سے مصافحہ کرتے وقت، ان کے ہاتھوں کی حرارت نے مجھے گرما دیا تھا۔ مَیں نے اقرار و انکار کے بین بین رہتے ہوئے کہا:

"ابھی نہیں، ضرورت محسوس ہوئی تو عرض کر دوں گا۔"

بے تکلفی کے ماحول میں باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ الفاظ کی قوسیں اور دائرے بنتے رہے اور

ان دائروں میں نئے دائرے اُبھرتے اور گم ہوتے رہے۔ مَیں نے انٹرویو کی طرف آتے ہوئے سب سے پہلا سوال کیا:

"اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔"

چودھری صاحب مسکرا دیئے اور پھر متانت کے لہجے میں بولے:

"آپ یہ سوال بڑے آدمیوں سے پوچھا کیجیے۔ انہیں ہی اس سوال کا جواب دینا زیب دیتا ہے۔ مَیں اس بارے میں ایک دوسرا ہی نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔ ہماری قوم کے مزاج میں شخصیت پرستی اس حد تک داخل ہو گئی ہے کہ وہ زندگی کے ہر کام کو اس زاویے سے دیکھتی ہے اور اسی پیمانے سے ناپتی ہے۔ ہر عملی قدم اٹھاتے وقت ہماری نظریں کسی ایسی مافوق الفطرت شخصیت کی متلاشی ہوتی ہیں جس میں معجزوں کی غیر معمولی قوت موجود ہو —— مجھے ڈر ہے کہ اگر اس رجحان کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ زہر ہمارے رگ و ریشے میں اس حد تک سرایت کر جائے گا کہ ہماری ذہنی اور عملی قوتیں ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائیں گی۔"

مَیں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں کہا:

"چودھری صاحب، مَیں آپ کی زندگی کے حالات اس لیے نہیں پوچھ رہا ہوں کہ مَیں ان سے شخصیت کے اصنام تراش لوں۔ میرے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ شاید آپ کی زندگی میں کوئی ایسی بات ہو جسے پڑھ کر کسی کے نیم مُردہ سینے میں جذب و عمل کی امنگیں کروٹیں لینے لگیں۔"

چودھری صاحب نے ایک شریف آدمی کی طرح ہتھیار ڈال دیئے اور انہوں نے اپنی زندگی کے جستہ جستہ واقعات بیان کرنے شروع کئے:

"مَیں ۱۹۰۵ء میں جالندھر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہُوا۔ میرے والد بزرگوار چودھری خیر الدین صاحب ایک معمولی سے زمیندار تھے۔ اگرچہ وہ خود پڑھے لکھے نہ تھے لیکن سر سید کی تحریک کے زیر اثر انہیں اپنے بچّوں کو تعلیم دلوانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اس معاملے میں اتنے محتاط تھے کہ سارا سارا دن ہمارے

مدرسے ہی میں بیٹھے رہتے۔ جس مدرسے میں مَیں پڑھتا تھا اس میں دینی ماحول کارفرما تھا۔ استاذ مکرّم عالم باعمل تھے۔ ان کی شفقت اور محنت نے مجھ میں علم کی پیاس پیدا کر دی، کتنے اچھے تھے وہ دن!"

یہ کہہ کر چودھری صاحب ایک دو منٹ کے لیے خاموش ہو گئے۔ اس خامشی نے میرے ذہن کو سوچنے پر مائل کیا۔ کتنا فرق ہے تیس چالیس سال پہلے کے والدین اور آج کے والدین میں۔

اب کون اپنے بچّوں کی تعلیم میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ بچّوں کو سکول بھیج کر والدین یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فرض ادا ہو گیا۔ ان کی اسی بے پروائی نے درسگاہوں کے معیار کو پست کر دیا ہے۔ اساتذہ اور والدین کے درمیان کوئی باہمی تعلق موجود نہیں، اور یہ ہمارے اساتذہ ـــ افلاس کے مارے ہوئے، احساسِ کمتری کے شکار اور معاشرے کے احترام سے محروم ـــ ان سے کیونکر توقّع کی جا سکتی ہے کہ یہ بچّوں میں حرّیت، خود اعتمادی اور عزّتِ نفس کے جوہر پیدا کر سکیں گے۔

چودھری صاحب عینک کے شیشوں میں سے میری ذہنی کیفیت کا مطالعہ کرتے رہے اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"شاید آپ بھی اپنے ماضی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں ماضی کیوں حسین نظر آتا ہے۔ مجھے اپنا ایک بیتا ہُوا واقعہ ابھی تک یاد ہے اور جب بھی تنہائی میں اس کے متعلّق سوچتا ہوں تو دل مسرّتوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ مَیں دس برس کا تھا، چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، قد بہت چھوٹا تھا، مجھے کتابیں پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مَیں لائبریری میں مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" لینے کے لیے گیا، کتاب کافی ضخیم تھی۔ استاد صاحب نے میرے جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تم اسے اٹھا بھی سکو گے؟" مجھے اپنے استاد کے یہ الفاظ آج بھی چونکا دیتے ہیں، خصوصاً اس وقت مجھے ایک طرح کی حیرت ہوتی ہے جب مَیں بڑے بڑے "فاضلوں" کو ہلکے پھلکے ناول اٹھائے ہوئے دیکھتا ہوں۔ غالباً یہ اس لیے ہے کہ یہ "اختصار" کا عہد ہے۔ اب علم سمٹ سمٹا کر ناولوں، خلاصوں اور شورٹ کٹوں میں محدود ہو گیا ہے۔"

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے چودھری صاحب کا لہجہ مغموم ہو گیا لیکن اس غمگینی میں بھی امید کی جھلک پائی جاتی تھی۔ انہوں نے میرے انہماک کو دیکھتے ہوئے ماضی کے چند اوراق پلٹنے شروع کیے:

"میٹرک کی منزل سے گزرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہُوا۔ شروع میں مَیں نے عربی کا مضمون منتخب کیا لیکن تین چار دنوں کے بعد مَیں نے سائنس کے مضامین لے لیے، ایک ہفتہ گزرنے کے بعد کالج کے برآمدے میں مجھے عربی کے اُستاد ملے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا:

"سُنا ہے تم نے "عربی شریف" کو چھوڑ کر "کُتّی سائنس" لے لی ہے؟"

عربی استاد کے یہ الفاظ سُنانے کے بعد چودھری صاحب قہقہہ مار کر ہنسے۔ مَیں بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔ بات بھی ہنسنے کی تھی۔ تاہم عربی استاد کے یہ الفاظ اس عہد کے رجحان کی عکاسی کر رہے تھے۔

چودھری صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:

"اب مَیں آپ کو ایک ایسا واقعہ سُنانے لگا ہوں جس نے زندگی کے بارے میں مجھے ایک مثبت اور امید افزا نقطۂ نظر بخشا۔ مَیں ابھی فرسٹ ایئر ہی میں تھا۔ انہی دنوں پڑھنے کے لیے ایک نئی کتاب ہاتھ لگی۔ اس کا نام CALCALUS MADE EASY اِس کتاب کے دیباچے میں مصنّف نے اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ریاضی قطعاً کوئی مشکل مضمون نہیں ہے۔ ریاضی دان اپنی بڑائی اور عظمت کا رعب جمانے کے لیے اسے ایک مشکل مضمون کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ دیباچے کے بعد ایک صفحہ خالی تھا اور جب مَیں نے اگلا صفحہ پلٹا تو اس صفحے کے عین وسط میں جلی حروف میں لکھے ہوئے یہ الفاظ دیکھے:

WHAT ONE FOOL CAN DO OTHER CAN

(جو کچھ ایک بیوقوف کر سکتا ہے وہی کچھ دوسرا بیوقوف بھی کر سکتا ہے)

مَیں یہ الفاظ پڑھ کر خوب ہنسا مگر ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہُوا کہ اس کارگاہِ حیات میں بڑے سے بڑا کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک انسان ایک کام کر سکتا ہے تو آخر دوسرا انسان وہ کام کیوں نہیں کر سکتا۔ بس اس

احساس نے مجھے ہمیشہ مشکل چیزوں کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل رکھا۔ مسلمان طلبہ ریاضی میں کمزور ہوتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ انہیں حساب نہیں آسکتا۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ جب ہندو طلبہ حساب میں ماہر ہوسکتے ہیں تو آخر تم کیوں نہیں ہوسکتے اور پھر انہیں کتاب میں لکھے ہوئے وہی الفاظ سناتا اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوتا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے ان لفظوں نے مجھے شکست یا ناکامی کے اندیشوں سے بڑی حد تک بے پروا کر دیا ہے۔ جب کوئی نازک وقت آن پڑتا ہے، یہ الفاظ میرے رہوارِ ہمت کے لیے تازیانے کا کام کرتے ہیں اور میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہوں۔"

"چودھری صاحب، آپ چار سال اسلامیہ کالج لاہور میں رہے۔ اس عرصے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش آیا؟"

"سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان چار سالوں میں مجھے علامہ اقبالؒ سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان کی دو نظمیں — "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" خود انہی سے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں سُنیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۲ء میں انجمن کا جلسہ شیرانوالہ دروازے میں منعقد ہونا تھا۔ ان دنوں علامہ اقبال بیمار تھے۔ ہم نماز کے بعد ان کی صحت کے لیے دعا مانگا کرتے تھے تاکہ ان سے نظم سُن سکیں۔ علامہ صاحب رُو بہ صحت ہوگئے اور انہوں نے نہایت ہی نحیف اور دردمند لہجے میں "خضرِ راہ" پڑھی اور جب یہ شعر ان کے ہونٹوں پر آیا تو ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

شاعرِ مشرق کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ یہ طویل نظم زبانی پڑھتے جا رہے تھے۔

۱۹۲۳ء میں ان آنکھوں نے ایک دوسرا ہی منظر دیکھا۔ اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں انجمن کا جلسہ تھا اور علامہ اقبال اپنی تازہ نظم "طلوعِ اسلام" پڑھ رہے تھے۔ اس بار اُن کے لہجے میں ایک خاص قسم کی گھن گرج تھی۔

مصطفےٰ کمال دشمنوں کو اپنے ملک سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پورے عالمِ اسلام میں زندگی کا تازہ خون دوڑتا ہوُا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نظم کا پہلا ہی شعر امیدوں، ولولوں اور امنگوں کا مظہر ہے۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی

اور اسی عرصے میں (غالباً ۱۹۲۴ء کی بات ہے) میں نے حبیبیہ ہال میں ڈاکٹر اقبال کا اجتہاد پر لیکچر سُنا۔ بعد میں یہی لیکچر تھوڑی سی ترمیموں کے ساتھ خطباتِ مدارس میں شامل کر لیا گیا۔ اسی ہال میں مولانا محمد علی آزاد، مسٹر جناح جیسی عظیم شخصیتوں کی تقریریں سُنیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا جوشِ عمل اور خلوصِ نیّت ہر شک اور شبے سے بالاتر تھا۔ ان کی تقریر میں خطابت کا جوش اور والہانہ پن رواں دواں تھا، لیکن مسٹر جناح کی تقریر، اختصار اور منطقی استدلال کا ایک حسین شاہکار تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ابوالکلام آزاد اپنے سحرِ خطابت سے دلوں کو مسخّر کر رہے تھے۔ ان کی تقریریں سننے کا بھی اتفاق ہُوا اور اس مضطرب ننّھے سے دلِ ناداں نے ہر ایک کرن کو جذب کرنے کی کوشش کی۔"

مَیں نے چودھری صاحب کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ اور سوالات کیے:

"آپ کن کن شخصیتوں سے متاثّر ہوئے ہیں؟"

"یوں تو مجھے سر سیّد کی شخصیت اور ان کے کارناموں نے بھی متاثر کیا ہے اور ایک مدّت تک "الہلال" کے ابوالکلام میرے ذہن میں ہلچل مچاتے رہے لیکن مجھ پر سب سے گہرا اثر علامہ اقبال کی مثنوی "اسرارِ خودی" نے ڈالا ہے۔ بالخصوص مولانا روم کے اُن تین شعروں نے جو "اسرارِ خودی" کے آغاز میں درج ہیں۔ اسرارِ خودی سے میرا تعلق اس طرح قائم ہوُا کہ ایک روز میرے ایک مشفق بزرگ جناب مرتضیٰ امیکش صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ اگر اقبال کو سمجھنا ہو تو اس کے لیے ان کے فارسی کلام کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ مَیں نے کہا کہ مجھے

تو فارسی زبان نہیں آتی۔ انہوں نے کہا یہ کوئی مشکل بات نہیں، تم میرے پاس آجایا کرو، مَیں تمہیں "اسرارِ خودی" سبقاً سبقاً پڑھا دوں گا۔ چنانچہ مَیں نے میکش صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا۔ میکش صاحب کے توسّط سے مجھے علامہ اقبال تک بار یابی حاصل ہوئی اور مَیں نے علامہ اقبال سے اسرارِ خودی کے کئی اسباق پڑھے۔ اس کتاب کے پہلے ہی سبق نے مجھے ایک مثبت نصب العین عطا کیا۔ یہ پہلا سبق مولانا رومؒ کے وہی تین شعر تھے جن کا تذکرہ مَیں پہلے کر آیا ہوں۔ وہ اشعار یہ ہیں :۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزو است

(کل جناب شیخ اپنے ہاتھ میں چراغ لیے شہر کا چکر لگا رہے تھے اور ساتھ ساتھ باآوازِ بلند کہتے جا رہے تھے کہ مَیں (کمزور) حیوانوں اور سفاک درندوں سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے ایک انسان کی تلاش ہے)

زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزو است

(مَیں اپنے سست اور کمزور دل ساتھیوں سے نالاں ہوں۔ مجھے تو خدا کے شیر اور رستم بن زال کی ضرورت ہے)

گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو است

(مَیں نے کہا کہ وہ انسان آپ کو نہیں ملے گا ہم نے اس کو برسوں تلاش کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جو چیز نایاب ہے مَیں اسی کی تو آرزو کرتا ہوں)

اِن شعروں نے مجھ پر یہ حقیقت روشن کی کہ زندگی کا مطمحِ نظر انسان بننا ہے ـــ ایک ایسا انسان جو

اتنا متوازن ہو کہ نہ وہ ظلم کرنا پسند کرے اور نہ وہ کسی اور کو اس بات کی اجازت دے کہ وہ اس پر ظلم کر سکے۔ انسان کے لیے سب سے بہتر راستہ یہ ہے کہ وہ افراط و تفریط کے کانٹوں سے دامن بچاتا ہوا اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔"

چودھری صاحب کے چہرے پر طمانیت کے آثار کے ساتھ ساتھ سعی و عمل کا اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس اضطراب کو دور کرنے کے لیے چودھری صاحب سے ایک فلسفیانہ سوال کیا:

"آپ اقبالؔ سے اسرارِ خودی پڑھتے رہے، آپ کے خیال میں ان کا تصورِ خودی کیا ہے؟"

"عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اقبالؔ کا فلسفۂ خودی یہ تھا کہ انسان اپنی ذات کو دوسروں پر ٹھونس دے لیکن یہ خیال کلیتہً غلط ہے۔ اسرارِ خودی میں علامہ صاحب نے عشقِ رسولؐ میں جو اشعار لکھے ہیں ان میں واضح طور پر خودی کا یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ انسان "ہوس" کے "لات و منات" توڑتا ہوا جب راہِ حق میں جدوجہد کرتا ہے اور اس جدوجہد میں کسی خطرے کو خاطر میں نہیں آتا، تو پھر اس میں خودی کا جوہر کھلتا ہے۔ حق کے لیے تڑپنا اور اس تڑپ میں اپنی ذات کو فنا کر دینے کا نام خودی ہے۔"

اقبالؔ کے بعد میں نے مولانا ابوالکلام آزادؔ کے بارے میں چودھری صاحب سے سوال کیا:

"مولانا آزادؔ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میں نے مولانا آزاد کو قریب سے دیکھا ہے، ان کی تمام تحریروں کو پڑھتا رہا ہوں۔ میں مرحوم کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ایک ۱۹۲۴ء سے پہلے کی زندگی ہے جسے میں ان کا "عہدِ رومان" کہتا ہوں۔ "رومان" سے میرا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں ان کی زندگی میں تخیل کو بہت زیادہ دخل حاصل تھا اور وہ ایک تخیلی ریاست کی تصویر کشی میں مصروف تھے۔ ۱۹۲۴ء یا اس کے لگ بھگ ان کی زندگی میں ایک بڑا تغیر رونما ہوا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب دنیا میں انقلاب لانے والی صرف ایک ہی طاقت ہے اور وہ ہے قومیت کی تحریک۔ وہ غالباً اسلام سے مایوس ہو چکے تھے اور انہوں نے یہ تصور قائم کر لیا تھا کہ

اب مذہب کی بنیاد پر کوئی انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔"

مجھے حیرت تھی کہ چودھری صاحب کو جو ایک سائنس کے طالب علم تھے، انہیں شعر و ادب اور شخصیات کے مطالعے کا وقت کیسے مل گیا۔ جب انہوں نے مجھے اقبالؔ، سعدیؔ، حافظؔ اور غالبؔ کے بے شمار اشعار سنائے اور متعدد مغربی فلسفیوں کے نظریات پر تنقید کی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ سائنس کی "خشک حقیقت پسندی" اور اعداد و شمار کی ناختم ہونے والی بوریت انہیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ مگر ہمارا حال ہی دوسرا ہے۔ قوم میں ایک ذہنی تحریک چل نکلی ہے جس کے مطابق ادب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد قرار پاتے ہیں لیکن مقامِ شکر ہے کہ ابھی ہم میں چودھری صاحب جیسی شخصیتیں موجود ہیں جنہوں نے سائنس اور ادب ـــــ دونوں سے زندگی کی عمارت تعمیر کی ہے اور اس میں نہایت ہی دلکش رنگ بھرے ہیں۔

"چودھری صاحب"، میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا، "آپ قائدِ اعظم اور شہیدِ ملت کے بہت قریب رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ پاکستان کو کس نوعیت کی ریاست بنانا چاہتے تھے؟"

چودھری صاحب کچھ دیر کے لیے خاموش رہے اور پھر محتاط زبان استعمال کرتے ہوئے کہنے لگے:

"یہ سوال آپ نہ پوچھتے تو زیادہ اچھا تھا۔ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جنہیں اگر صاف صاف بتا دیا جائے تو غلط فہمیوں، شکوک اور فتنوں کے پرورش پانے کا خطرہ ہے کیونکہ لوگ غلط معنی پہنا لینے میں خاصے ماہر ہیں۔ اتنی بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں محسن، پاکستان کو جدید طرز کی جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے اور انہیں پارلیمانی نظامِ حکومت پسند تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لیے اس سرزمین میں اسلام کو کارفرما قوت حاصل ہوگی۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ اڑھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ خیال آیا چودھری صاحب تھک گئے ہوں گے۔ میں نے بے تکلفی کے عالم میں چودھری صاحب سے پوچھا:

"آپ تھک تو نہیں گئے؟"

"کیسا تھکنا! رہروانِ شوق کب تھکا کرتے ہیں! آپ سے مل کر مَیں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا ہوں۔"

مَیں نے چودھری صاحب کے چہرے کی بشاشت کو دیکھتے ہوئے پھر باتیں کرنا شروع کر دیں:

"چودھری صاحب، آپ کے ذہن میں پاکستان کے مسائل کا کیا حل ہے؟"

مسائل حل کرنے اور ملک کو ترقی دینے کے لیے دو باتیں بہت ضروری ہیں۔ اوّل یہ کہ زمامِ اقتدار صحیح لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور دوئم یہ کہ صحیح لائحۂ عمل مرتّب کیا جائے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ اگر صحیح پالیسی مرتب کر لی جائے لیکن اسے نافذ کرنے کے لیے صحیح ہاتھ دستیاب نہ ہوں تو اچھے نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اسی طرح اگر ایماندار اشخاص برسرِ اقتدار آ جائیں لیکن وہ متوازن حکمتِ عملی سے کام نہ لے سکیں تب بھی مفید نتائج برآمد نہ ہوں گے۔"

"صحیح لوگوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟" مَیں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے پوچھا۔

"میرے نزدیک پاکستان میں زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آنی چاہیے جو قیادت کی صلاحیتیں اور اسلام پر کاربند رہنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں اور یہ اشخاص جمہوری طریقوں سے اوپر آئیں۔ صرف عوام کے نمائندوں کو حکومت چلانے کا حق پہنچتا ہے۔ مَیں ماہرین (EXPERTS) کو اس بناء پر حکومت پر قابض ہونے کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک میدان یا فن میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ مَیں علماء کا بھی یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ چونکہ انہوں نے قرآن اور حدیث میں ایک فن کی حیثیت سے کمال حاصل کیا ہے اس لیے اقتدار انہیں سونپ دیا جائے۔ اسی طرح معاشیات، عمرانیات، سیاسیات اور فوجی امور کے ماہرین بھی یہ حق نہیں رکھتے۔"

"لیکن چودھری صاحب، اگر جاہل عوام ایسے نمائندے منتخب کریں جو معاملات حکومت کو سمجھنے اور انہیں چلانے کے اہل نہ ہوں، یا وہ اتنے بددیانت اور خودغرض ہوں کہ اپنے مفادات پر قوم کے مفاد قربان کر دیں، تو ایسی جمہوریت کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے؟"

میرے اس سوال پر چودھری صاحب کا لہجہ جوش آمیز ہوگیا۔ انہوں نے مجھ پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پھر نہایت سنجیدہ اور متین انداز اختیار کرتے ہوئے کہنے لگے :

"یہ غلط ہے کہ ملک کی بدنظمی اور تباہی کے ذمے دار جاہل عوام ہیں۔ جنہیں آپ جاہل کہتے ہیں، ان کا اس سے زیادہ اور کیا قصور ہو سکتا ہے کہ وہ چلچلاتی گرمیوں اور خون جما دینے والی سردیوں میں ہل چلاتے ہیں اور اپنے خونِ جگر سے صحراؤں کی باغبانی کرتے ہیں۔ قریشی صاحب، یہ ساری خرابی ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے جنہیں آپ "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان تمام خرابیوں کا واحد حل صرف یہ ہے کہ ملک میں جمہوریت کو کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ عوام ایک دو بار انتخابات میں غلطیاں کریں گے لیکن تجربات کے نتائج انہیں جلد ہی باشعور اور سمجھ دار بنا دیں گے۔ دوسری طرف قوم کا درد رکھنے والے افراد اور جماعتیں اپنی تمام تر توجہ عوام کی دینی، اخلاقی اور سیاسی تربیت پر مرکوز کر دیں۔ اگر ہم عوام کو صحیح خطوط پر تربیت دینے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ملک میں ایک ایسا مضبوط اور متوازن نظامِ حکومت قائم ہو جائے گا کہ پھر "ماہرین" کو بریک استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میرے خیال میں سیاسی جماعتوں کے لیے صرف یہی کام کرنے کا ہے اور میں اسی کام کو مقدور کی حد تک سرانجام دینے کے لیے میدانِ سیاست میں آیا ہوں۔ میں متوسط طبقے میں کام کروں گا تاکہ اس میں سے قیادت ابھرے۔ صرف یہی قیادت عوامی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی اہل ہوگی۔"

چودھری صاحب نہایت شستہ اور بلیغ الفاظ میں اپنے مطالب ادا کیے جا رہے تھے۔ وہ اپنے موقف کی حمایت میں قرآن، حدیث، اسلامی تاریخ اور مقدمہ ابن خلدون سے دلیلیں اور واقعات پیش کر رہے تھے۔ مجھے ان کے یہ الفاظ بڑے بھلے معلوم ہوئے :

"قریشی صاحب، مارشل لاء کی برکات سے جہاں اور لوگوں نے اپنی جھولیاں بھر لی ہیں وہاں ایک نعمت مجھے یہ میسر آئی کہ میں نے اس عرصے میں فقۂ اسلامی کی بنیادی کتابوں کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا ہے، مجھے اس "سعادت" پر فخر ہے۔

"اچھا، چودھری صاحب، اب یہ بتائیے کہ ملک کے حالات خراب کیوں ہوئے؟" میں نے ذرا اور نزدیک ہوتے ہوئے پوچھا۔

"حالات کی خرابی میں یوں تو کئی عوامل کام کرتے رہے لیکن اس میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض کردار دانشوروں نے ادا کیا۔ تعلیم تو انسان کو باضمیر، غیور، نڈر، اور جرأت مند بناتی ہے کیونکہ علم کی روشنی اس میں فراست اور اعتماد پیدا کرتی ہے لیکن ہمارے اکثر دانشور کم ہمّت، بے اصول اور بے ضمیر نکلے جنہیں قوم کی قیادت سنبھالنی چاہیے تھی اور اپنے جرأت مند اقدامات سے غلط کاروں کے ہاتھوں کو روک دینا چاہیے تھا، وہ ایک بے حس تماشائی کی حیثیت سے بگاڑ کو پھیلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جو برسرِ اقتدار آیا انہوں نے اس کا قصیدہ لکھ دیا اور اگر وہی شخص اقتدار سے محروم ہو گیا تو اس کی بے شمار برائیاں گنوا دیں ــ دانشوروں کی زندگی کا مقصد تو بہت عظیم ہوتا ہے۔ وہ صداقت اور اصولوں کی خاطر اقتدار کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا کرتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہ ہوا اور اس کے نتیجے میں ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

"چودھری صاحب، مشرقی اور مغربی پاکستان میں جو ایک بُعد پایا جاتا ہے، آپ اسے کیونکر دُور کرنا چاہتے ہیں ــ" میں نے ایک نہایت ہی اہم مسئلے کو چھیڑ دیا۔

"محبت و یگانگت پیدا کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں بازوؤں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ صرف عوام ہی امید کی آخری کرن ہیں۔ اونچے طبقے سدھرتے نظر نہیں آتے۔ ملک میں ایسی ثقافتی، دینی اور سیاسی تنظیمیں ہونی چاہئیں جو "عوام سے عوام تک" کی تحریک چلائیں اور مجھے کامل یقین ہے کہ یہ تحریک غلط عناصر کو خس و خاشاک کی طرح باہر نکال پھینکے گی۔"

چودھری صاحب نے جونہی آخری لفظ ادا کیا، میں نے ایک اور نازک مسئلے کو موضوعِ گفتگو بنایا۔

"ملک کا نظم ونسق (ایڈمنسٹریشن) کیونکر بہتر بنایا جاسکتا ہے؟"

چودھری صاحب میرے سوال پر کچھ غمگین سے ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں حزن وملال کے ڈورے ابھر آئے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن غالباً الفاظ ان کے احساسات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا:

"نظم ونسق کو برسوں کی پیہم اور مسلسل کوششوں سے مستحکم اور مضبوط بنایا گیا تھا لیکن اس میں بگاڑ بڑی تیزی سے داخل ہوا۔ نظم ونسق میں ابتری عموماً اس وقت پھیلتی ہے جب ایسے لوگ برسرِ اقتدار آجائیں، جو بددیانت اور خوشامند پسند ہوں۔ صاحبِ اقتدار کی بددیانتی اور خوشامد پسندی نظم ونسق میں بے ضابطگی، جانبداری اور تساہل پسندی کو جنم دیتی ہے۔ ایسے حالات میں محکموں کے سربراہوں اور کارکنوں میں خوشامد کرنے کا ذہن بھی پرورش پاتا ہے اور ان کی توجہ کام کی بجائے "صاحبِ اقتدار" کو جائز وناجائز طریقوں سے خوش کرنے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ذمہ دار "سربراہ" خود بددیانتی کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اپنے ماتحت عملے کو کس طرح بددیانتی کرنے سے روک سکتا ہے۔ نظم ونسق صرف اسی صورت میں بہتر ہو سکتا ہے کہ اقتدار دیانتدار، با اصول اور محبِّ وطن لوگوں کے ہاتھ میں آئے۔"

اب میں آخری سوال کرنے کے لیے ذہن میں لفظوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ یہ آخری سوال ۵۶ء کے دستور کے متعلق تھا۔ بڑے غور وخوض اور سوچ بچار کے بعد میں نے سوال ان لفظوں میں ادا کیا:

"اگر آپ سے ۵۶ء کے دستور میں ترمیم کرنے کے لیے کہا جائے تو کیا آپ اس میں کوئی ترمیم کرنا پسند کریں گے؟"

"جی ہاں، میں اس میں ایک ترمیم کرنا پسند کروں گا۔ تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ "تحریکِ عدمِ اعتماد" اور "تحریکِ اعتماد" کے لیے "صرف اکثریت" کافی نہیں۔ میرے خیال میں ان دونوں کے لیے ایوان کے ارکان کی ۵۵ یا ۶۰ فیصد اکثریت کی حمایت ضروری قرار دی جائے۔ اس ترمیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ چند لوگ جو کنارے"

پر ہوتے ہیں، ایوان کو غیر متوازن نہیں کر سکیں گے۔"

"چودھری صاحب، اونچے اونچے لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۶ء کا دستور "مصالحتوں" کا دستور تھا۔"

"مصالحت کوئی بُری بات نہیں۔ سیاست میں "مصالحت" سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ ہاں اصولوں پر مصالحت نہیں ہونی چاہیے۔"

مَیں نے چودھری صاحب کو ۵۶ء کے دستور کے بارے میں اپنے تاثرات بتائے۔ انہوں نے گہرے انہماک کے ساتھ میری باتوں کو سُنا اور میری اس بات سے اتفاق کیا کہ دوسرے ممالک کے دساتیر اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں ہم دستور کو اور زیادہ بہتر بنا سکتے ہیں۔

رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ چودھری صاحب بھی کچھ تھک سے گئے تھے۔ مَیں چلنے کے لیے اُٹھا اور جب مَیں چودھری صاحب سے مصافحہ کر رہا تھا تو ان کی چائے کی پیشکش یاد آ گئی۔ باتوں کی حرارت اور حلاوت میں چائے کا خیال تک نہ آیا، سوچا اب چودھری صاحب کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ رات کے سناٹے میں جب مَیں مال روڈ کو طے کر رہا تھا تو میرے کانوں سے خامشی کے نغمے ٹکرانے لگے اور مجھے یوں محسوس ہُوا کہ سرد رات مجھے اپنی آغوش میں لے لینا چاہتی ہے۔

چودھری نذیر احمد خاں

گلبرگ کی نشاط انگیز فضا میں چودھری نذیر احمد خاں حکومتِ پاکستان کے اٹارنی جنرل کا خوبصورت بنگلہ شاہراہِ گلبرگ گلبرگ پر واقع ہے۔ مَیں، جناب اثر صہبائی اور جناب ڈاکٹر اعجاز قریشی وقتِ معیّن پر چودھری صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس طویل القامت چودھری صاحب نے ڈرائنگ روم میں استقبال کیا اور ہم پر ایک نگاہ ڈالی۔ ڈالی نہیں بلکہ جمادی۔ ایک ایسی نگاہ جو درد مند انسان کے اُن ہاتھوں کی مانند ہو جو دستِ صبا بن کر بساطِ محفل میں جگر کے داغ اور نشستِ درد ڈھونڈا کرتے ہیں۔

یہ مرحلہ طے ہُوا تو سلسلۂ کلام شروع ہُوا۔ چودھری صاحب نہایت صاف اور شستہ اُردو بولتے ہیں اور جب کبھی باتیں کرتے کرتے شعر بھی کہہ جاتے ہیں تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کوئی ایرانی چینی کی ڈبیوں کے ساتھ چائے پی رہا ہے۔

ایک انسان کی زندگی اتنی متنوع اور وسیع ہوتی ہے کہ اس کے تمام گوشوں کا چند گھنٹوں میں مطالعہ کرنا ناممکن ہے تاہم چند گھنٹوں کی صحبت میں چودھری صاحب کا جو امتیازی کردار ہمارے سامنے آیا ہے وہ زندگی

کی دشواریوں سے نبرد آزما رہنے کی ایک خلش ناتمام ہے۔ بچپن ہی سے ان میں جدوجہد کا شوق پروان پاتا رہا۔ جوانی میں یہ شوق کالج کی ثقافتی سرگرمیوں اور ہنگاموں میں اپنی تشنگی بجھاتا رہا اور جب عملی دنیا میں قدم رکھا تو ٹھہرے ہوئے ماحول میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہی خلشِ ناتمام اب بھی باقی ہے اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ ان کا رکھ رکھاؤ کا ساتپاک کہیں آگ نہ لگا دے۔

میں ہوں پروانہ کہیں شمع تو ہو، رات تو ہو
جان دینے کو ہوں تیار، کوئی بات تو ہو

اعمال کا محاسبہ کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ جہاں تک نظریات کا تعلق ہے چودھری صاحب کے متعلق یہ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسلامی ذہن کے مالک ہیں۔ اسلام کی عظمت و سربلندی ان کی زندگی کا ایک بڑا مقصد ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اونچے اونچے ایوانوں میں اسلام کے نام سے گونج پیدا کرنے کی وہ بے پناہ جرأت و ہمّت رکھتے ہیں اور یہ ان کی زندگی کا نہایت ہی روشن پہلو ہے۔

چودھری صاحب اکبر الہ آبادی کے بہت بڑے شیدائی ہیں۔ ان کے ہزاروں اشعار انہیں زبانی یاد ہیں۔ انہوں نے اپنے عہدِ وزارت میں کلیاتِ اکبر الہ آبادی کو نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کروایا۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو شاید کلیات، اوراقِ پریشاں ہی رہتیں۔ اردو ادب پر چودھری صاحب کا یہ عظیم احسان ہے۔

س: ابتدائی زندگی کے حالات اس انداز میں درکار ہیں کہ خاندان اور گھر کے ماحول کی صحیح تصویر سامنے آ جائے۔

ج: میں نے ۱۳ ستمبر ۱۸۹۸ء کو سیالکوٹ کے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ میرے والد محبوب عالم صاحب اس وقت تحصیلدار تھے اور بعد میں ترقی کرتے کرتے ملازمت کے اعلیٰ مدارج تک جا پہنچے۔ میرے والد صاحب کی شخصیت میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک انہیں قومی کاموں میں گہری دلچسپی تھی اور دوسرے طبعاً فراخ دل اور مہمان نواز تھے۔ اس بناء پر گھر پر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آنیوالوں

میں اہلِ علم، اہلِ دل اور اہلِ قلم سب ہی شامل ہوتے تھے۔ گھر پر محفلیں جمی رہتیں اور والد صاحب ہمیں آنے والے حضرات سے ملنے جلنے اور محفلوں میں شریک ہونے کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ بالالتزام ہم سب بھائیوں کو بلاتے۔ دراصل والد بزرگوار یہ چاہتے تھے کہ ان کے بچوں کی شخصیت کو آزاد فضا میں پرورش پانے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ غیر ضروری پابندیاں عائد کرنے سے بچے کے جذبات ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیت گھٹ کر سکڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ہر جائز شوق کو پورا کیا اور ہمارے ناپسندیدہ رجحان کو اس طرح روکا کہ ہماری عزتِ نفس کو ٹھیس بھی نہ لگی اور ہماری اصلاح بھی ہو گئی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

مَیں دس بارہ برس کا تھا کہ ایک دن مَیں اپنے ملازم کے توسط سے پتنگ اڑانے کا شوق پورا کر رہا تھا۔ اتنے میں والد صاحب آ گئے۔ مَیں نے ان سے پتنگ چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہوں نے دیکھ لیا۔ پاس بلا کر پوچھا: "بیٹا کیا کر رہے تھے؟" مَیں نے شرمندگی سے گردن جھکاتے ہوئے کہا: "پتنگ اڑا رہا تھا۔" والد صاحب نے ملازم کو دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ، اچھی سی پتنگ اور ڈور لے آؤ۔ چنانچہ مَیں نے چھ ماہ تک خوب پتنگ اڑائی اور اس کے بعد جی ایسا بھرا کہ پھر کبھی پتنگ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میرا خیال ہے کہ اگر والد صاحب مجھے پتنگ بازی سے سختی کے ساتھ روکتے تو شاید مَیں چوری چھپے برسوں تک گھٹیا پتنگیں اڑاتا رہتا۔

والد بزرگوار نے میری تربیت میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا تھا (۱) زیادہ سے زیادہ علم حاصل کیا جائے (۲) زندگی میں سخت کوشی اور ریاضت کی عادت ڈالی جائے۔ ان خطوط پر انہوں نے ہمیں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ترغیب دی۔ مَیں غالباً ایف اے میں تھا۔ والد صاحب نے مجھ سے پوچھا: "ہیر رانجھا پڑھی ہے؟" مَیں نے اپنی شرافت اور نیک چلنی کی داد حاصل کرنے کے لیے کہا: "نہیں۔" انہوں نے کہا: "اسے ضرور پڑھیے، اس میں پنجابی معاشرے کی صحیح تصویر ملتی ہے۔" مجھے سخت کوشی کا عادی بنانے کے

لیے وہ اکثر مجھے اپنے ماتحت افسروں کے ساتھ دوروں پر بھیج دیتے۔ مَیں نے ان دوروں میں زندگی کے حقائق کو بہت قریب سے دیکھا۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہو گیا تھا جب مَیں ابھی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

والدہ مرحومہ کی عبادت گزاری، نیک نفسی، والد صاحب کا قومی کاموں میں انہماک اور ان کی مہمان نوازی، گھر میں علمی، ادبی اور مذہبی مجالس میں زندگی کی حرارت نے میرے ذہنی افق پر انمٹ نقوش مرتب کیے، جو آج تک منزلِ حیات کے چراغِ راہ ثابت ہو رہے ہیں۔

س: تعلیم کے آغاز، مضامین کے انتخاب اور اپنے اساتذہ کے بارے میں کچھ بتائیے۔

ج: تعلیم کا آغاز عام بچوں کی طرح ہُوا، البتہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے تین سال میری تعلیمی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ والد صاحب ان دنوں ریاست ٹونک کے وزیر اعظم ہو گئے تھے۔ مجھے ریاستی ماحول کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ظاہری شان و شوکت، انعامات کی بارشیں، اقتدار کا کھوکھلا پن، عوام کی مفلسی اور غربت اس زندگی کے نمایاں خدوخال تھے۔ اس منظر نے میرے شعور و آگہی میں ایک تلاطم سا پیدا کر دیا، تاہم یہاں کے قیام کے دوران میں مجھے ادبی رسائل کے مطالعے کا زیادہ وقت ملا۔ مخزن کے ذریعے مَیں اکبر الہ آبادی سے روشناس ہُوا۔ ایسا روشناس ہُوا کہ زندگی بھر کا تعلّق قائم ہو گیا۔ ان ہی دنوں بڑے بھائی تعلیم کی غرض سے علی گڑھ چلے گئے تھے۔ وہ جب وہاں سے گھر آتے تو علی گڑھ کی باتیں کرتے۔ ان کے ذریعے سے مَیں علی گڑھ کی تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہُوا۔ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہُوا اور یہیں سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ دراصل مجھے نصابی کتابوں سے کبھی بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہیں رہا۔ مَیں کالج کی ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں میں زیادہ حصّہ لیتا تھا۔ کرکٹ ٹیم کا سیکرٹری تھا۔ راوی کا جس نے علم و فن کے بے شمار گلزار کھلائے، مَیں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہُوا۔ کئی سال تک ڈرامیٹک کلب کا مینجر رہا۔ میرے نزدیک ان سرگرمیوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہاں

سے انسان بہت کچھ سیکھ کر نکلتا ہے۔ ڈرامیٹک کلب دراصل ایک چھوٹی سی دنیا ہے اور جو اس دنیا کے کاروبار چلانا سیکھ لیتا ہے وہ باہر کی وسیع و عریض دنیا میں بڑے اعتماد سے آگے بڑھتا ہے اور اپنے حاصل شدہ انتظامی تجربات کی بدولت کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں نے ایم۔ایس سی۔ میں داخلہ لیا لیکن ایک سال بعد ذہن میں کچھ ایسا انقلاب آیا کہ میں نے لا کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے متعدد اسباب تھے۔

س : وہ اسباب کیا تھے؟

ج : تمام وجوہ کا ذکر کرنا تو یہاں بے فائدہ ہے۔ صرف یہ بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ شروع ہی سے طبیعت آزادی کی طرف مائل تھی پھر بی۔ایس سی کرنے کے بعد احباب و اقارب کے اصرار پر ملازمت کے لیے کئی کوششیں کیں۔ اس سعی و جد و جہد میں سرکار شاہی ذہنیت کے کچھ ایسے گوشے سامنے آئے کہ ملازمت کی طرف سے دل بالکل متنفر ہو گیا اور فیصلہ کر لیا کہ آزاد پیشہ اختیار کروں گا۔ قانون کے پیشے میں چونکہ بہت زیادہ آزادی ہے اس لیے میں نے اسے اختیار کیا۔

س : قانون کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد آپ کی زندگی کس نہج پر چلتی رہی؟

ج : والد صاحب نے قومی کاموں میں حصہ لینے اور ریاضت کی زندگی گزارنے کی جو چنگاری میرے دل میں روشن کر دی تھی اس کی تپش نے ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے مضطرب و بے قرار رکھا۔ میں نے وکالت کا آغاز ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ منٹگمری سے کیا۔ پاؤں جمتے ہی میں نے ۱۹۲۴ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ اس کانفرنس نے پنجاب میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑا دی۔ اس کانفرنس کے بعد میں نے ضلع منٹگمری سے ۲۴ ہزار روپے جمع کیے اور مسلم ایجوکیشنل کوآپریٹو ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ اس ایسوسی ایشن نے مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ بلا مبالغہ اس ادارے کے توسط سے سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان وکلاء، انجینیئر اور ڈاکٹر بنے۔ اس طرح لوگوں میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا

ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تو ہم لوگوں نے اسے پندرہ منٹ کے لیے منٹگمری سٹیشن پر روکے رکھا اور مَیں نے مخلوط انتخاب کے خلاف اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ میری پوری زندگی اسی نوع کی شورشوں سے پُر ہے۔ مسلم لیگ تحریک سے وابستگی کے بعد سے اس کے لیے مسلسل کام کرتا رہا۔ قائدِ اعظم کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسّر آئے اور ان کی عظیم شخصیت اور انقلاب آفرین قیادت نے کئی بار ہمارے ڈگمگاتے قدموں کو ثابت قدمی عطا کی۔ اب جب ان کا پیکرِ عزم تصوّر کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو سارے بدن میں ایک برقی رَو دوڑتی ہوئی محسوس کرتا ہوں۔ ایک ایسی رَو جو بے جان جسد میں زندگی کے شعلے بھر دیتی ہے۔

س : آپ کے خیال میں وکلاء ذہین قیادت کی تخلیق میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں ؟

ج : میرے خیال میں وہ اس میدان میں نہایت ہی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل ہیں۔ دراصل ملکی قانون کا اس ملک کے معاشرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ عموماً جس تحریک کے ساتھ وکلاء وابستہ ہو جاتے ہیں وہ اکثر کامیابی سے ہم کنار ہؤا کرتی ہے۔ وکلاء سے ملک کا ذہین طبقہ ہمیشہ متاثر ہوتا ہے اور اگر وکلاء ایمانداری، جرأت مندی اور بیباکی کا ثبوت دیں تو ملک کی فکری اور ذہنی فضا میں خوش گوار انقلاب رونما ہونا یقینی ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس طبقے نے اپنی ذمہ داریوں کو نہ پوری طرح سمجھا ہے اور نہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ آخر صرف پیسہ کمانا ہی تو زندگی کا واحد مقصد نہیں۔

س : کیا آپ کے خیال میں اسلام کا تعزیراتی قانون پاکستان میں کسی ردّ و بدل کے بغیر رائج کیا جاسکتا ہے ؟

ج : اسلامی قانون کا وہ حصّہ جو قرآن و حدیث میں تصریحاً موجود ہے اس میں ردّ و بدل کی کوئی گنجائش نہیں اور مَیں اس بات کا مؤید ہوں کہ پاکستان میں اسلام کا قانون من وعن نافذ کیا جائے۔ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹے جانے پر اعتراض کیے جاتے ہیں سعودی عرب میں اس سزا

کے جاری ہونے کے اثرات دیکھ لیجیے، ممکن ہے کہ وہاں اور جرائم ہوتے ہوں لیکن چوری کا ارتکاب کوئی نہیں کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے واضح اثرات اور نتائج کی موجودگی میں لوگ اس سزا کو جاری کرنے سے کیوں ہچکچاتے ہیں، اس کے علاوہ موجودہ تعزیرات پاکستان کے مطابق بعض اوقات ایک آدمی کو آٹھ آنے چرانے پر عمر قید تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجرم کو ریاست کے خرچ پر پالنے کی بجائے اسے ایسی سزا کیوں نہ دی جائے جو اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی عبرت بنے۔

مجھے ایک دفعہ امریکہ کے قانون دانوں کی ایک اونچی مجلس میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ حاضرین میں سے کسی ایک نے سوال کیا: "کیا آپ چور کے ہاتھ کاٹے جانے کے حق میں ہیں؟" میں نے کہا: "ہاں"۔ اس نے کہا: "اس سزا پر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔" میں نے پوچھا: "وہ کون لوگ ہیں؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرائے، یا جنہوں نے لاکھوں معصوم عورتوں اور رحمِ مادر میں پرورش پانے والے ہزاروں بچوں اور بے گناہ ضعیفوں کو موت کی نیند سلادیا، یا جنہوں نے انسانیت کا خون درندوں کی سی بہیمیت کے ساتھ بہایا۔ اس خون سے اپنے محلات وقصور کی زیبائش و آرائش کے سامان پیدا کیے۔ کیا وہ اس سزا کو بہیمانہ کہتے ہیں؟"

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

اور جب میں یہ سوال کر رہا تھا تو ہر طرف کامل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

س: ملک میں موجودہ قانونی نظام میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے؟ آپ اس ضمن میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج: ہمارا قانونی ڈھانچہ مکمل تبدیلی چاہتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی قانون کے نفاذ کے بغیر اصلاح

ناممکن ہے اور اسلامی قانون کا نفاذ بھی اس طرح ہو کہ اسے پورے کا پورا نافذ کیا جائے۔ اسلام ایک مربوط اور منضبط ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے کچھ حِصّوں کو اپنا لینا اور کچھ حِصّوں سے انحراف اختیار کرنا قطعاً سود مند نہیں۔ میرا یقین ہے کہ اسلام کے نظامِ قانون کو نیک نیتی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے ہی میں ہماری فلاح و کامرانی مضمر ہے۔ تاہم اسلام کے قانونی نظام کو ازسرِ نو مدوّن کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مَیں تاریخی نظائر کو قرآن اور سنّت کی حیثیت نہیں دیتا ہم قرآن و سنّت کے اصولوں کی روشنی میں اپنے لیے ایک قابلِ عمل نظامِ قانون منضبط کر سکتے ہیں۔

س : ہمارے ملک کے قانون کے کالجوں میں جو محمڈن لاء پڑھایا جاتا ہے کیا وہ اسلامی قانون کا فہم پیدا کرنے کے لیے کافی ہے ؟

ج : قطعاً کافی نہیں۔ مجھے سب سے بڑا اعتراض لفظ "محمڈن" پر ہے اور رنج یہ ہے کہ یہ لفظ ابھی تک باقی ہے۔ انگریزوں نے ہمارے رسولؐ کی عظمت گھٹانے کے لیے اس کے نام کے ساتھ گستاخانہ بے حرمتی کا رویہ اختیار کیا۔ کیا دنیا کے کسی مذہب کے پیشوا کے نام کو اس طرح بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے ؟ پہلے محمدؐ کے انگریزی حروف میں کتر بیونت کی گئی اور پھر اس کو مخفف کیا گیا۔ یہ ساری کوششیں ناپاک مقاصد کے لیے کی گئی تھیں اور پھر محمڈن لاء کی ترکیب گھڑ کر یہ نفسیاتی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ قانون خدا کی طرف سے بھیجا ہُوا نہیں ہے بلکہ نعوذ باللہ محمدؐ کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس لفظ کا وجود ہمارے جسم پر ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اسلامی قانون کی روح سے یکسر خالی ہیں۔ یہ اسلامی قانون کا فہم تو کیا پیدا کریں گی، یہ الٹا اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔

س : ملک میں قانون کا احترام پیدا کرنے کے لیے کونسی تدابیر کارگر ہو سکتی ہیں ؟

ج : قانون کا احترام پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اچھے قوانین وضع کیے

جائیں اور ملک میں ایسے ادارے موجود ہوں جو قانون کی صحیح تعبیر و تشریح کر سکیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قانون بنانے والے اور قانون نافذ کرنے والے قانون کا پورا پورا احترام کریں۔ دوسری طرف تعلیم، اخبارات اور نشریات کے ذریعے عوام میں قانون کی پابندی کا احساس و شعور مسلسل اُبھارا جائے۔

س : آپ کو قائداعظمؒ اور شہیدِ ملّت کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملتے رہے ہیں۔ وہ پاکستان کو کس قسم کی ریاست بنانا چاہتے تھے؟

ج : قائداعظم کے متعلق یقین و ثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے کبھی اُن سے اِس موضوع پر بالمشافہہ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ان کی تقریروں اور تحریروں سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں

> کہ وہ پاکستان کو ایک آزاد اور اسلامی ریاست بنانے کے خواہش مند تھے، جس میں اقلیتوں کے ساتھ آزادی اور رواداری کا سلوک کیا جائے اور جس میں مذہب ایک شکنجے کی حیثیت سے استعمال نہ ہو۔

شہیدِ ملّت یقیناً اسلامی ریاست کے حامی تھے، لیکن ان کے بیانات میں بعض اوقات سیاسی مصلحتوں کا پرتو نظر آتا تھا۔ میرا یقین ہے کہ اگر موت انہیں مہلت دیتی تو وہ آزادی اور مذہب کی طرف زیادہ جُھک جاتے۔ زندگی کے آخری دَور میں انہوں نے اس طرف جُھکنا شروع کر دیا تھا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اور باتوں کے علاوہ یہ دو باتیں ان کی شہادت کا سبب بنیں۔

شہیدِ ملّت کو جن حالات میں کام کرنا پڑا، وہ اندرونی طور پر کچھ زیادہ خوش گوار نہیں تھے۔ مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب لیاقت مرحوم یہ فیصلہ کر کے بیٹھے تھے کہ خواہ ہمیں کتنی دیر تک بیٹھنا پڑے، ہم قراردادِ مقاصد کو آخری شکل دے کر اور اس کے متعلق آخری فیصلہ کر کے اٹھیں گے۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ ایک محترمہ نے قرارداد کے خلاف بولنا شروع کیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ یہ قرارداد منظور کرنے کے بعد ہم دُنیا کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ آخر میں میری باری آئی۔ میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: کہنا

تو بہت کچھ چاہتا تھا، مگر آپ کے صبر کا امتحان پہلے ہی بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ اپنے مرشد (اکبر الٰہ آبادی) کے صرف تین اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

یہ پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تُو مسلماں ہے
مَیں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
اگر اقرار کرتا ہوں تو بے مِہری کرے شاید
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا مَیں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

س : ہمارے معاشرے میں جو ہمہ گیر اخلاقی بگاڑ رونما ہُوا ہے اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں اور اس کو روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟

ج : ہمارے اخلاقی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اپنی جڑ سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اکبر آبادی نے ان اشعار میں ہماری صورتِ حال کا صحیح نقشہ کھینچا ہے ؎

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں تم کو اے ڈالیو!
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

قرآن اور سنت ہماری زندگی کا منبع ہیں اور انہی میں اصلاح کا طریقِ کار اور تدریجی عمل سب کچھ موجود ہے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں کوئی اشکال نہیں۔ لمبے چوڑے منصوبے بنانے کی بجائے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف رجوع کی ضرورت ہے۔ مَیں نے مشرق اور مغرب کے مختلف معاشروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے۔ ان کے پیدا کردہ ثمرات کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اصلاحِ احوال کے لیے ہمیں اسلام ہی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ صرف اسلام ہی میں اصلاحِ معاشرہ کی گنجائش ہے۔ باقی مذاہب اصلاح کی قطعاً کوئی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسلام میں انسانی مساوات کا تصوّر صرف نظریاتی نہیں بلکہ عملی ہے۔ اسلامی معاشرے میں رنگ اور نسل کے امتیازات فی الواقع مٹ گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں عیسائی معاشرے کو دیکھئے، وہاں کالوں اور گوروں کے لیے اب بھی علیحدہ علیحدہ گرجے موجود ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اصلاحِ معاشرہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دیکھئے اسلام نے شراب پر پابندی لگا کر معاشرے کو بے شمار خرابیوں سے محفوظ کر لیا ہے۔ جن معاشروں میں شراب عام ہے وہ اس کے مہیب نتائج سے کانپ اٹھتے ہیں۔ مجھے نیوزی لینڈ میں ایک اعلیٰ عہدہ دار نے بتایا کہ "ہمارے معاشرے میں ساٹھ فی صد جرائم کا ارتکاب شراب نوشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور نوّے فی صد طلاق کے واقعات اس دُختِ رز کی پیداوار ہیں" —— یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے صاف ستھرے معاشرے کو از خود ناپاک بنائیں اور اس میں وہ تمام خرابیاں داخل کرنے کی کوشش کریں جن کی تباہ کاریاں اب اتنی عیاں ہیں کہ کوئی اندھا ہی ان سے بے خبر رہ سکتا ہے۔

اصلاح کا سب سے مؤثر اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں سرورِ دو عالمؐ کی ذات کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ رسولِ خداؐ کی محبّت ہر مسلمان کے رگ و پے میں اچھی طرح رچ بس جائے۔ اس عظیم انسان کی شخصیت سے ہم اتنا والہانہ عشق رکھتے ہوں کہ اس کے ہر حکم کو ذہن و قلب کی پوری آمادگی کے ساتھ بجا لائیں۔ اس نوع کی وابستگی اور شیفتگی پیدا کیے بغیر ہمارے معاشرے میں کوئی خوش گوار تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ کتنا دردناک المیہ ہے کہ وہ انسان جسے کسی پیمانے سے بھی ناپ لیجیے عظمت کا منتہا نظر آتا ہے، اس سے ہماری عقیدت اور ہمارا تعلق روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور ہم ان انسانوں کو اپنا راہنما بنانے چلے ہیں جو خود قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی ذات سے عقیدت دو طریقوں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اولاً تمام سکولوں میں سیرت النبیؐ کا مطالعہ لازمی قرار دیا جائے۔ درسی کتابوں میں رسولِ اکرمؐ کی اخلاقی زندگی کے نمونے اس طرح پیش کیے جائیں کہ بچوں میں ان اخلاقی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کا شوق بڑھے۔ ہمارے پاس یہی تو سرمایہ ہے۔ اگر ہم نے اسے اپنی نو زائیدہ نسل تک نہ پہنچایا تو ہمارا جرم ناقابلِ معافی ہوگا۔ کالجوں میں رسول اللہ کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ لازمی قرار دیا جائے اور اس پرچے میں کامیاب ہونا امتحان میں کامیابی کے لیے لازمی شرط ہو۔

اس کام کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے پیارے نبیؐ کا یوم ولادت پوری سنجیدگی اور اہتمام سے منانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ سرکاری طور پر محفلیں منعقد ہوں اور ریاست کے ذمہ دار افراد ان میں حصہ لیں اور سرکاری عہدہ داران کے لیے اس تقریب میں موجود رہنا لازمی قرار دے دیا جائے۔ عوام میں رسول اکرمؐ کے لیے بے پناہ محبت ہے لیکن چونکہ حکومت ان جذبات کے اظہار کے لیے مناسب مواقع اور رہنمائی بہم نہیں پہنچاتی اس لیے یہ جذبات غلط اور ناموزوں شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس یومِ مسعود پر حکومت کی سرگرمیاں اور اس کا انہماک عوام پر نہایت ہی اچھے اثرات مترتب کرے گا اور اس طرح عوام اور حکومت ایک دوسرے کے قریب آئیں گے اور جب پورے ملک میں ایک ہی سی پاکیزہ فضا پیدا ہو جائے گی تو رسولؐ سے وابستگی اور شیفتگی میں از خود اضافہ ہوتا جائے گا۔

س : پاکستان میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے آیا اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے یا ہمیں اپنے تقاضے اسلام کے مطابق ڈھالنے چاہئیں؟

ج : اسلام کے متعلق یہ مصرع پڑھنے کو جی چاہتا ہے

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اسلام دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے، مغلوب اور محکوم ہونے کے لیے نہیں۔ اسلام کے اصولوں میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن کے ذریعے سے صرف آج ہی کے نہیں بلکہ آنے والے ترقی یافتہ

معاشروں کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں پہلے ہی اتنی لچک اور فطری اعتدال موجود ہے اور وہ اتنا مکمل، جامع اور واقعاتی ہے کہ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی پورے نظام کو تلپٹ کر دینے کے مترادف ہوگی۔ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا نعرہ نہایت ہی گمراہ کن ہے۔ اسلام لوگوں کی زندگیوں کو مخصوص سانچوں میں ڈھالنے کے لیے آیا تھا۔ اپنے آپ کو لوگوں کی پسند کے مطابق ڈھال لینا اس کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کے مقصدِ وجود ہی کے خلاف ہے۔

س : رومن رسم الخط اختیار کرنے کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

ج : اس موضوع پر میں اپنی رائے کا اظہار بار بار کر چکا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ رومن رسم الخط اختیار کرنے سے ہمارا پورا دینی، ثقافتی، تاریخی، لسانی، صوتی اور احساساتی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور ہم ایسے راہرو بن کر رہ جائیں گے جن کا ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

س : اسلامی دولتِ مشترکہ کے قیام کے امکانات کس حد تک روشن ہیں؟

ج : اسلامی دولتِ مشترکہ کے قیام پر غور و فکر کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی دولتِ مشترکہ کا تصوّر ہماری زندگی سے کیا تعلّق رکھتا ہے۔ مَیں دولتِ مشترکہ کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا اپنا دینی فریضہ تصوّر کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (مسلمان بھائی بھائی ہیں) ہم اپنی زندگی میں "بھائی" کا یہ تصوّر رکھتے ہیں کہ بھائیوں کے مابین گہرے تعلقات ہوں، ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوں، اجتماعی بہبود کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔ اگر ہم بھائی کا عام زندگی میں یہ تصوّر رکھتے ہیں تو پھر عالمگیر مسلم برادری کے بارے میں ہمارے احساسات کیوں مختلف ہوں۔ مسلمان کو بھائی مان لینے کا لازمی اور قدرتی تقاضا ہے کہ ساری دُنیا کے مسلمان ایک دوسرے کو جانیں اور اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوں۔ اسی کا نام اسلامی دولتِ مشترکہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کا قیام قرآنی تعلیمات کا عین اقتضاء ہے۔

رہا یہ سوال کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال میں اس کے قیام کے کتنے امکانات روشن ہیں، تو میرے نزدیک یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ راہ کی دشواریاں تسلیم! لیکن کیا دشواریوں کو دیکھ کر جادۂ حق کی طرف سرے سے قدم ہی نہ بڑھائے جائیں؟ راہ کی دشواریاں تو عزم کو راسخ کیا کرتی ہیں اور پائے عمل کو تیزی اور استطاعت عطا کرتی ہیں ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میرا یہ یقین ہے کہ ایک منصوبے کے تحت اگر کام کیا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ مَیں اس مقصد کے لیے مسلسل کوشش کرتا رہوں گا۔ مَیں اپنا منصوبہ عوام کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ دیکھئے کتنے اہلِ عزیمت اس منزل کے راہی بنتے ہیں۔

س : آپ کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اُردو ادب بالخصوص شعر سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ آپ کو کن کن ادیبوں اور شعراء نے متاثر کیا؟

ج : جیسا کہ مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ گھر میں اکثر علم و ادب کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس ماحول نے میرے ذوق اور ذہن کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ سر سید، حالیؔ، شبلیؔ کے علمی اور ادبی کارنامے میرے سامنے تھے۔ فی الحقیقت قوم پر ان کے بے شمار احسانات ہیں لیکن سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں اس زبان سے روشناس کرایا جس کو سمجھے بغیر ہم اقبالؔ کے فکر اور اس کی زبان کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا خونِ جگر دے کر گلشنِ ادب کی آبیاری کی اور آنے والوں کے لیے راہیں ہموار کیں۔ میری زندگی پر سب سے گہرا اثر اکبر الٰہ آبادی کی شاعری نے ڈالا ہے۔ وہ میدانِ شعر میں ایسے مجاہد نظر آتے ہیں جو تنِ تنہا آزادی کے لیے نبرد آزما رہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے حکومت کی ملازمت میں رہتے ہوئے مؤثر انداز میں مغربی تہذیب اور مشرقی معاشرے کی خرابیوں

پر بھرپور طنز کی جس نے ایوانِ حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر اقبال کی چشم بینا نے حقیقت کو جس انداز میں نظارہ کیا ہے اس دور کی کوئی شخصیت اس انداز میں حقیقت کو نہ دیکھ سکی۔ مولانا ظفر علی خاں کا نعتیہ کلام مجھے بے حد پسند ہے۔ ان کا یہ شعر پڑھ کر تو مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ میں ایک غیر مرئی عالمِ وجد و نشاط میں گم ہو جاتا ہوں ؎

آنکھ کے اک اشارے سے تو نے معاً بدل دیے
ذہن کے سب تصوراتؔ قلب کے سب تاثرات

اور جگر کا یہ شعر جب بھی اسے پڑھیے ایک نئی لذتِ کیف بخشتا ہے ؎

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

مولانا حسرت موہانی کی شاعری سے زیادہ میں ان کی عظیم شخصیت سے متاثر ہوں۔ سادگی اور خاکساری کے وہ ایک حسین پیکر تھے۔ ان کی زندگی سرتاپا خلوص اور صدق تھی۔ اب ان جیسے انسان کہاں ملیں گے۔

حکیم نیّر واسطی

جناب حکیم نیّر واسطی صاحب سے ملاقات کے لیے رات کا وقت مقرر ہوا۔ میں، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور مقبول جہانگیر صاحب سمن آباد کی نور و نکہت سے بسی ہوئی فضا کو الوداع کہتے ہوئے اندرونِ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بیرون مستی دروازے میں نیّر واسطی صاحب کی اقامت گاہ ہے جس کی تعمیر و ترتیب میں موسموں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ واسطی صاحب سے تین گھنٹے باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں کے دوران میں قہقہے بکھرتے رہے ——— یہ قہقہے کتنے اثر انگیز تھے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مجھ جیسا شخص جو وقت سے پہلے سنجیدگی کا مجسّمہ بن گیا ہے، وہ بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

حکیم صاحب پر پہلی نگاہ پڑتے ہی یہ تاثّر اُبھرا کہ وہ ایک وضعدار قسم کے آدمی ہیں اور وضعداری بھی ایسی، جو اب خال خال نظر آتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میز اور کُرسی جنہیں آج وہ مطب میں استعمال کرتے ہیں اور وہ چوغا جسے پہن کر وہ مطب میں بیٹھتے ہیں اس وقت کے ہیں، جب انہوں نے آج سے تقریباً چالیس سال قبل لاہور میں حکمت کا کام شروع کیا تھا۔ وہ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور یونانی زبان بھی جانتے ہیں اور دیارِ فرنگ بھی ہو آئے

ہیں، لیکن ان کے لباس اور وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوچتا ہوں یہ کتنے گہرے سمندر ہیں کہ اتنا کچھ پی لینے کے بعد بھی کناروں سے باہر نکل نہیں نکلتے۔ اپنا یہ عالم ہے کہ ادھر دو چار لفظ انگریزی کے آئے اور ادھر سارا جسم انگریزی ملبوسات و تکلّفات میں ڈوب گیا۔

حکیم صاحب کو تاریخِ طب سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ غیر ممالک میں جا کر لائبریریاں چھانی ہیں۔ ڈاکٹروں اور حکیموں سے ملے ہیں اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ فرانسیسی، ترکی اور یونانی زبانوں کے جانے بغیر اس فن کی تاریخ کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا تو وہ ساٹھ سال کی عمر میں مصروفیتوں کے انبار کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں ترکی اور فرانسیسی زبانوں کی کلاسوں میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور طالب علم ہی کی حیثیت سے انہیں سیکھا۔ آج کل یونانی زبان کی تحصیل کی فکر میں ہیں۔ کیا یہ شخصیت قوم کے لیے ایک لمحۂ فکریہ نہیں؟ کاش یہ لگن اور کسک قوم کے ہر فرد کے جسم میں لہر بن کر اٹھے اور اسے طوفان کا سا اضطراب عطا کرے۔ ع

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

نیر صاحب شعر و ادب کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے ہیں اور خود بھی شعر کہتے ہیں۔ عربی، فارسی، اُردو، ترکی، فرانسیسی زبانوں کے ادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ فارسی اور عربی کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ نثر نہایت شگفتہ اور رواں لکھتے ہیں اور جب اس رواں رواں نثر میں شعر کے حسن کی آمیزش بھی کر دیتے ہیں تو نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ یہ میکدہ، شعر و حکمت، اختر و سلمیٰ اور طب العرب کے مصنّف ہیں۔ میں جب شعر و حکمت میں اس شعر تک پہنچا تو محبت و عشق کی لازوال داستانیں میرے ذہنی افق پر اُبھر آئیں ؎

پھر وہی ہم وہی تنہائی ہے
جس کا ڈر تھا وہی رات آئی ہے

نیر واسطی صاحب ایک خلیق، مونس اور نہایت ہی غمگسار انسان ہیں۔ وہ تعلقات کو نہایت احتیاط اور فیاضی

کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ ایک دفعہ جس سے دل مل گیا، اس سے زندگی بھر کی رسم و راہ قائم ہو گئی۔ پھر ذرا فرق نہیں آنے دینگے۔ غریبوں کے لیے تڑپتا ہُوا دل رکھتے ہیں۔ ان کا مفت طبّی علاج کرتے ہیں اور کسی امیر شخص کو کسی غریب پر کبھی ترجیح نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں مَیں نے دولت سے جتنی بے نیازی برتی، اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی ہی خوش حالی سے نوازا۔ کاش! بے نیازی کا یہ چلن عام ہو جائے۔

س : زندگی کی ابتدائی منازل کیونکر طے ہوئیں؟

ج : مَیں ۱۹۰۱ء میں یو۔ پی کے ایک قصبہ نہٹور ضلع بجنور میں واسطی سادات کے خاندان میں پیدا ہُوا۔ والد مرحوم سیّد مظفّر حسین جو نگینہ ضلع بجنور میں وکالت کرتے تھے، بڑے پاک باز، صوفی، باخدا درویش اور بزرگ تھے۔ ہوش سنبھالا تو ان کی محافلِ حال و قال میں تصوّف اور عرفان کے ان نغموں سے کان آشنا ہوئے۔

حسن جب مقتل کی جانب تیغِ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا
بے مروت ناوک افگن آفریں صد آفریں
دل کا دل زخمی کیا پیکاں کا پیکاں لے چلا

ابھی نو سال ہی کا ہُوا تھا کہ والد مرحوم کے سایۂ تربیت سے محروم ہو گیا۔ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری چچا مرحوم نے اپنے ذمّے لے لی۔ انہوں نے مجھے زندگی کی ان راہوں پر ڈالا جن پہ قدم بڑھانا اس وقت عزّت اور شرافت کا عین تقاضا تھا۔

س : وہ راہیں کون سی تھیں؟

ج : وہ راہیں — جنہیں آج لوگ بھُول گئے ہیں اور جن کے بھُول جانے سے ہی شاید ہم میں زوال و انحطاط کے آثار رونما ہوئے ہیں۔ یہ تحصیلِ علمِ دین اور تعمیرِ سیرت کی راہیں تھیں۔ مجھے قصبے کے ایک اسلامی مدرسے

میں داخل کرا دیا گیا، جہاں فارسی کی تعلیم حسبِ دستور "آمدنامہ" اور "حمد باری" سے شروع ہوئی اور گلستاں و بوستاں کی منزلیں طے کرتی ہوئی "سکندر نامہ" اور "شاہنامہ" تک پہنچی اور اسی طرح عربی کی تعلیم میزان و منشب سے شروع ہو کر علوم متداولہ تک جاری رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے اساتذہ کی نگاہوں میں کیا سحر تھا جو ہمارے اذہان و قلوب میں یکسوئی، بے نیازی کے ساتھ ساتھ جذب کی سی کیفیت بھر دیتا تھا۔ حصولِ علم کی جو آگ انہوں نے سینے میں لگا دی تھی وہ ساری زندگی مجھے اضطراب کے انگاروں پر لوٹاتی رہی۔ میں آج بھی اپنے آپ کو بالکل اسی طرح کا ایک طالب علم سمجھتا ہوں جیسا میں آج سے پچاس سال پہلے ہوا کرتا تھا۔

اس مدرسے سے نکل کر علم کی تلاش میں ہر اُس سمت کی طرف لپکا جدھر جدھر سے علم کی شمیم عطر بیز آئی۔ دہلی، لکھنؤ، بریلی، دیو بند اور حیدر آباد دکن اس وقت علم و فضل کے گہوارے تھے۔ یہاں یکتائے روزگار جمع تھے جن کی ضیاباریاں زندگی کے دامن کو نیرنگیوں، شادابیوں اور جگمگاہٹوں سے پُر کر رہی تھیں۔ مجھے علمِ حکمت میں حکیم اجمل خاں، شعر و ادب میں سائل، بیخود، عزیز لکھنوی، اور حضرت ثاقب اور تصوّف و علومِ دینیہ میں مفتی کفایت اللہ، خواجہ حسن نظامی اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اکتسابِ فیض کے مواقع ملے اور جب ۱۹۲۵ء میں لاہور آیا تو اس عروس البلاد کی شعری اور ادبی رنگینیوں میں اس طرح کھو گیا کہ سینتیس اور چھتیس سال گزار دینے کے بعد آج بھی پہلے دن کی سی تشنگی محسوس کرتا ہوں اور اب بھی یہ حالت ہے کہ ع

صبحدم صحنِ گلستاں میں صبا کے جھونکے
آتشِ دردِ محبّت کو ہوا دیتے ہیں

س : آپ کو فنِ طب کے ساتھ طبعی دلچسپی تھی یا حالات نے آپ کو طب کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا؟

ج : جس زمانے میں مَیں نے شعور کی آنکھیں کھولیں، اس وقت دو ہی چیزوں کی مانگ تھی۔ یا یوں کہیے کہ قدر و منزلت ان دو چیزوں کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ طب، میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ان دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتا۔ چنانچہ قدم مؤخر الذکر راستے پر چل نکلا اور

پھر اتنا سبک ہوا کہ واپس آنے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ آج جب ایک طرف اس پیشے کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کا دوسری طرف اپنے طبعی ذوق اور فطری مذاق کے تقاضوں کا جائزہ لیتا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ غلط جگہ پھنس گیا۔ تمام دن چند بیماریوں کا تذکرہ اور چند نسخے، ذہن کو بوجھل کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، کاش! کتنا اچھا ہوتا کہ میرے مرنے کے بعد میرے گھر سے بھی وہی کچھ نکلتا، جو غالبؔ کے ہاں سے نکلا تھا ؎

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

س : آپ نے طب کی تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی؟

ج : یوں تو اس کوچے کی بہت خاک چھانی ہے، لیکن اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات صرف دو مقام ہی ہیں۔ یونانی طب کا مطالعہ طبیہ کالج دہلی میں کیا اور وہیں سے اس فن کے ماہروں سے عملی تجربات حاصل کیے۔ حکیم اجمل خاں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس کے بعد جب لاہور میں آیا تو ایلوپیتھی کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ وہ سب کتابیں جو ہمارے ہاں ایم بی بی ایس کے کورس میں شامل ہیں ان کے اردو ترجمے عثمانیہ یونیورسٹی کی وساطت سے مجھے دستیاب ہو گئے اور میں نے انہیں مختلف ڈاکٹروں کی رہنمائی میں سبقاً سبقاً پڑھا۔ اس طرح میری نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی اور میں قدیم و جدید نظریات اور ان کی ارتقائی منازل سے بخوبی واقف ہو گیا۔

س : جیسا کہ آپ نے بتایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں طب پر جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اردو زبان میں ہیں۔ تو کیا ہمارے ملک میں یہ کتابیں انگریزی کتابوں کی جگہ لے سکتی ہیں؟

ج : جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے اس کے بارے میں آخری بات تو اربابِ حل و عقد ہی کہنے کے مجاز ہیں، لیکن میری رائے یہ ہے کہ اگر ہمارے میڈیکل کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو جائے تو اس سے بے شمار فوائد حاصل ہوں گے۔ میں صرف چند فوائد کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

اگر ذریعۂ تعلیم اردو میں ہو جائے تو تعلیم کی مدت میں کمی کی جا سکتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ انگریزی کی کتاب کے اگر میں پچاس صفحے پڑھتا تھا تو اتنی مدت میں اسی موضوع پر اردو میں لکھی ہوئی کتاب کے بلا مبالغہ تین سو صفحات پڑھ جاتا تھا۔ اس تناسب سے کورس جلد ختم ہو سکتا ہے اور طلبہ کے قیمتی سال بچائے جا سکتے ہیں۔

۲۔ اردو زبان میں لکھی ہوئی بات جلد سمجھ میں آ جاتی ہے اور ذہن اس کا پوری طرح احاطہ کر لیتا ہے۔ انگریزی زبان میں زیادہ وقت بات کو پڑھنے اور اس سے زیادہ وقت اسے سمجھنے میں لگتا ہے۔ اکثر طلبہ جب بات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں تو وہ کتاب کے رٹنے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ صاحبِ فکر و نظر جانتے ہیں کہ یہ طریقہ نہایت ہی ناقص ہے۔

۳۔ اس سلسلے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر ذریعۂ تعلیم اردو ہو جائے تو پھر طلبہ ایک نقطے کو سمجھ کر اس پر مزید تحقیق بھی کر سکتے ہیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے باعث ہمارے ہاں آج تک کوئی بلند پایہ تخلیقی کام نہ ہو سکا۔ عمر کا بڑا حصہ کتابیں رٹنے میں گزر جاتا ہے اور جب ایک شخص عمر کا ایک بڑا حصہ اور کثیر زر لگا کر ڈاکٹر بن کر نکلتا ہے تو وہ روپیہ پیسہ کمانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں یہی ہو سکتا ہے۔ تحقیق اور تخلیق کے لیے مزید وقت کہاں سے نکالا جائے اور ایک رٹنے والے دماغ سے تخلیق کی توقع رکھنا ہی عبث ہے۔

۴۔ ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے بدلنے سے ہمارے طلبہ میں قومی احساس اور شعور اور بھی زیادہ پختہ ہوگا۔ اہلِ ایران اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں میڈیسن کے جملہ مضامین فارسی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ روس میں بھی ایسا ہی ہے کہ وہاں میڈیکل مضامین روسی زبان میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مصر میں عربی زبان اس مقصد کے لیے استعمال کی جا رہی ہے، میڈیکل مضامین کا ابھی تک انگریزی میں پڑھایا جانا ہمیں بار بار اپنی قومی زبان کی کم مائیگی اور دوسری قوموں کی ذہنی اور علمی برتری

کا احساس دلاتا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں کی نایابی بذاتِ خود ایک سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔ آخر ہر سال کثیر زرِمبادلہ ان کتابوں کی درآمد پر کیوں خرچ کی جائے؟

س : یونانی طب اور ایلوپیتھی میں بنیادی فرق کیا ہے اور کیا ان دونوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟

ج : میرے نزدیک علم طب کے ان دونوں شعبوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں بلکہ ایلوپیتھی قدیم طب یونان ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ ان دونوں کے درمیان تسلسل کا ایک گہرا ربط قائم ہے جن لوگوں کی تاریخِ طب پر گہری نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ یونانی طب اور ایلوپیتھی کے مابین ایک تاریخی رشتہ موجود ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے ممالک میں یونانی طب اور ایلوپیتھی یکجا پڑھائے جاتے ہیں چین میں تو یہ دستور ہے کہ ہسپتال کے ایک کمرے میں دیسی حکیم اور دوسرے کمرے میں ڈاکٹر بیٹھتا ہے۔ جب کوئی نازک مسئلہ سامنے آتا ہے تو یہ دونوں آپس میں مشورہ کرتے ہیں ہمیں ان دونوں شعبوں میں جو دُوری نظر آتی ہے اس کی ایک معقول وجہ ہے۔ غالباً سیاسی اور دوسرے وجوہ کی بناء پر ادویات کی تاریخ (ہسٹری اوف میڈیسن) اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ شروع میں یا تو یونانی حکماء کے نام سامنے آتے ہیں یا پھر ایک دم جدید طبی ماہرین کے کیے ہوئے کام ابھرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے لے کر تیرھویں اور چودھویں صدی کے درمیان کا حصّہ کہاں گیا؟ اس طویل عرصے میں اس فن پر کوئی کام نہیں ہُوا؟ دراصل یہی وہ زمانہ ہے، جب مسلمان حکماء نے اس میدان میں محیر العقول کارنامے سر انجام دیے اور انہوں نے اپنی مساعیِ جمیلہ سے اس فن کو نہ صرف زندہ کیا، بلکہ اسے حرارت، زندگی اور تابناکی عطا کی۔ اس دَور کو تاریخ سے نکال دینے کے بعد خلا کا پیدا ہو جانا تو بالکل ایک قدرتی سی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سقوطِ بغداد کے بعد مسلمانوں کا علمی و طبّی ذخیرہ دو حصّوں میں بٹ گیا۔ اس کا ایک حصّہ ایران کے راستے ہم تک پہنچا اور دوسرا سسلی اور ہسپانیہ کے راستے اہلِ یورپ کے ہاتھ لگا۔ اسی ذخیرۂ علم کی بنیاد پر یورپ میں تحقیقی اور تجرباتی مراکز قائم

ہوئے۔ وہاں کے ماہرینِ ادویات نے بہت کچھ اس علم سے لیا۔ مثال کے طور پر بلڈ پریشر کے مرض کو لیجیئے۔ اس کے لیے یونانی طب میں الشفا کے نام سے ایک دوا موجود تھی۔ جدید ڈاکٹروں نے اسی دوا کے اجزاء پر سرپاسل اور فلاڈلفیا کی دوائیں تیار کیں۔ یہ حقائق ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ مشرق و مغرب کی طب دراصل مسلمانوں کی متاعِ گم گشتہ ہے اور ان دونوں نظامہائے طب کا منبع ایک ہی ہے۔

اسی تحقیق کی بناء پر میری یہ رائے ہے کہ ہمارے میڈیکل کالجوں میں اس دور کو خصوصیت کے ساتھ شاملِ نصاب کیا جائے۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک طرف طلبہ قدیم نظریات اور تجربات سے استفادہ کر سکیں گے اور دوسری طرف جب وہ مسلمان حکماء کے طبی کارنامے پڑھیں گے تو ان میں اپنے اسلاف کے بارے میں ایک اچھا تاثر پیدا ہوگا جو انہیں خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار کردے گا۔

ہر دور میں قدیم اور جدید نظریات کے مابین اتحاد اور ملاپ کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ برِصغیر پاک و ہند میں حکیم اجمل خاں یہی کام کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اس اعتبار سے ہمیں ان دونوں شعبہ ہائے علم سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمارا مقصد امراض کے خلاف جنگ ہے اور اس جنگ میں جہاں سے بھی کارآمد اور مؤثر اسلحہ دستیاب ہو لے لینا چاہیے۔

س : حکیم صاحب! کیا وجہ ہے کہ ہم یونانی علاجِ طب سے چمٹا کیوں رہنا چاہتے ہیں جبکہ یونانی حکماء کے سامنے وہ لوگ تھے جن کا مزاج ہمارے مزاج سے یقیناً مختلف تھا تو پھر آج سے ہزارہا سال پہلے اور مختلف ماحول میں لکھی ہوئی کتابیں اب ہمارے لیے کیا سودمند ثابت ہوں گی؟

ج : جی ہاں، یونانی حکمت کی اصطلاح سے واقعی یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس فن کا تمام تر سرمایہ یونان سے متعلق ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اب یونانی طب سے وہ طب مراد ہے جو یونان

کے بعد عربوں کے ہاتھ میں آئی اور عربوں نے اس میں کئی اور علاقوں کی حکمت کا نچوڑ داخل کیا۔ مثال کے طور پر ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں ہند سے بہت سے حکماء بغداد آئے اور انہوں نے یونانی طب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اس طرح آریو ویدک کے تمام اجزاء اس طب میں داخل ہو گئے جسے اب بھی یونانی طب کہا جاتا ہے۔ کُشتے آریو ویدک ہی کے ذریعے اس طب میں رواج پذیر ہوئے اور بعینہٖ ایران، عرب، شام اور ہسپانیہ کے مسلمانوں نے اپنے عہدِ زریں میں تحقیق اور تخلیق کے بیش بہا موتی اس خزینے میں داخل کیے اور اس طب کو ایک ایسا سمندر بنا دیا جس میں مختلف اطراف سے دریا آ کر گرتے ہیں۔

س : آپ کے خیال میں دیسی علاجِ طب کو پاکستان میں کس طرح فروغ مل سکتا ہے؟

ج : دیسی علاجِ طب کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں انگلستان کے بارے میں ایک رپورٹ سائنس ڈائجسٹ میں شائع ہوئی ہے کہ وہاں دیسی ادویہ بڑی تیزی سے مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ میرے نزدیک دیسی علاجِ طب کو ان طریقوں سے فروغ دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات یہ ہے کہ ملک میں دارالتراجم قائم کیے جائیں جن میں یونانی حکماء کی اصل کتابوں (جو اب دستیاب ہیں) کے ترجمے کیے جائیں اور ساتھ ساتھ مسلمانوں نے عربی زبان میں حکمت پر جو گرانقدر کام کیا ہے اسے بھی اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس طرح فن سائنٹیفک بنیادوں پر ترقی کرتا چلا جائے گا۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں کی مدد سے طبیہ کالجوں کے لیے نیا نصابِ تعلیم بنایا جائے۔ موجودہ نصاب بہت پرانا ہے اور یہ تحقیق کی روح سے قطعاً خالی ہے۔ یہ قدم اٹھائے بغیر خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

پھر ایسے تجرباتی اور تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں جن میں اس فن پر مزید تحقیق اور تجربات کیے جائیں۔

اگر زندگی ہر لحظہ تغیر پذیر ہے تو پھر فن میں جمود کیوں کر جائز ہے۔ اس طرح کام کرنے سے دیسی طب کا دامن وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ دیسی طب سے واقفیت رکھنے والے دوسرے علوم اور زبانیں بھی جانتے ہوں۔ وہ بلادِ اسلامیہ اور یورپ کے کتب خانوں میں جائیں اور ان گوہر ہائے گرانمایہ کو دیکھیں اور ان سے استفادہ کریں جو وہاں کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ لندن کی ویلکم لائبریری میں مشرقی طب پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔

اور سب سے زیادہ اہم ضرورت یہ ہے کہ حکومت دستِ تعاون دراز کرے۔ اس کی رہنمائی اور اعانت کے بغیر اتنا عظیم منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا، وہ اس علاج کو عام کرے اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرے جو اس میدان میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

س : دیسی علاجِ طب کے بارے میں یہ شکایت اب عام ہے کہ یہ بتدریج گراں ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اس گرانی کے کیا اسباب ہیں ؟

ج : یہ شکایت کسی حد تک ٹھیک ہے لیکن اس گرانی کے پیچھے چند عوامل کارفرما ہیں۔ دراصل برصغیر کی تقسیم کے بعد طب کو اچھا خاصا دھچکا لگا۔ وہ اس طرح کہ ادویہ کے ذخائر جمع کرنے کے طریقے ہندوؤں کو آتے تھے اور وہ انہیں صاف کر کے منڈیوں میں لاتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد یہ نظام تقریباً معطل ہو گیا۔ ظاہر ہے جب ادویہ کی رسد کا کوئی معقول انتظام نہ رہا تو علاج کو مہنگا ہی ہونا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف پہاڑوں پر بڑی قیمتی جڑی بوٹیاں موجود ہیں، لیکن کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں ہے جو ان کا حکمیاتی تجزیہ کرے اور انہیں استعمال کے قابل بنائے۔ ہمیں ادویہ کے لیے زیادہ تر ہندوستان سے درآمد کی ہوئی دواؤں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن لائسنس کی کمی کی وجہ سے یہ بہت ہی کم مقدار میں درآمد ہوتی ہیں اور یہ امر گرانی میں اضافے کا

باعث بنتا ہے۔

پھر اس طرف بھی کوئی دھیان نہیں دیا جا رہا کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں کی اپنے ہی ملک میں کاشت کی جائے۔ ہمارے ملک میں ہر طرح کی آب و ہوا اور زمین میسّر ہے میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کاشت کا تجربہ یقیناً کامیاب رہے گا۔

گرانی کی ایک اور واضح وجہ یہ ہے کہ مبادل اشیاء بھی گراں ہو گئی ہیں۔ طبیبوں کو زندگی کی ضروریات سے علیحدہ تو نہیں رکھا جا سکتا۔

س : حکیم صاحب، کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں امراض بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں؟

ج : واقعی امراض میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ مَیں نے اس مسئلے پر خاصی سنجیدگی سے سوچا ہے اور مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ متعدد عوامل اس کے ذمہ دار ہیں:

انٹی بیاٹک ادویہ کا غیر محتاط استعمال:

اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔ حیاتیاتی جراثیم کثیر مقدار میں تحلیل ہو رہے ہیں اور یہ بات انسانی صحت کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ مَیں ان کے استعمال کے خلاف نہیں لیکن غیر محتاط اور اندھا دھند استعمال کسی بھی اعتبار سے مفید نہیں۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ غذا میں ملاوٹ کی جاتی ہے جو صحت کو مسلسل نقصان پہنچا رہی ہے کتنے سفّاک اور انسانیت دشمن ہیں وہ لوگ جو چند سکّوں کی خاطر انسانی صحت جیسی قیمتی چیز سے کھیلتے ہیں۔

غربت بھی صحت کی خرابی کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ ایک شخص کو جس معیاری اور متناسب غذا کی ضرورت ہے وہ ایک غریب آدمی ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کام کی زیادتی اور معاشی تفکرات انسان کو گھن کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔

صحت کے اصولوں سے عدم واقفیت:

ایک اور بڑا سبب ہے جو ہزاروں امراض کو جنم دے رہا ہے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں چار سال کی عمر تک کے بچے بہت زیادہ مرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مائیں بچوں کی طبّی دیکھ بھال کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتیں۔ وہ بے خبری اور عدم واقفیت کی بناء پر از خود بچوں کو موت کے منہ میں دھکیلتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آسان زبان اور ہو سکے تو پنجابی زبان (یعنی علاقائی زبانوں) میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شائع کیے جائیں تاکہ عورتوں کو بچوں کے بارے میں بنیادی معلومات تو حاصل ہو جائیں۔ بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ لڑکیوں کے نصاب میں اس چیز کو شامل کیا جائے۔

اسی طرح جنسی امور پر ہمارے ہاں قابلِ اعتماد لٹریچر موجود نہیں۔ جب جنس زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں عدم واقفیت اچھے نتائج کیسے پیدا کر سکتی ہے۔ ہم نے اسے شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ بے خبری کے عالم میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کے اثرات سے زندگی بھر چھٹکارا نہیں ملتا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنی رہنمائی میں جنسیات پر سائنٹیفک اور علمی لٹریچر شائع کرے۔

کچھ اسی قسم کا مسئلہ نوجوان لڑکوں کا ہے۔ غلط قسم کے لوگوں نے نہایت ہی گھٹیا لٹریچر شائع کر کے نوجوانوں کو غلط راہوں پر ڈال رکھا ہے۔ پوشیدہ امراض کے نام پر نوجوان دھوکا کھا رہے ہیں اور بلا ضرورت پریشان ہیں۔ اگر معقول اور مفید لٹریچر موجود ہو تو یہ دکانیں بالکل بند ہو جائیں اور نوجوان بھی غلط قسم کی "جوانی" سے نجات پا جائیں۔

س: صحت کو برقرار رکھنے کا سب سے اچھا اصول کیا ہے؟

ج: اعتدال: زندگی کے ہر کام میں اعتدال صحت کا نہایت ہی زریں اصول ہے۔

س : آپ کبھی اپنے ملک سے باہر بھی گئے ہیں؟

ج : جی ہاں، ایک بار نہیں کئی بار، اور ایک جگہ نہیں کئی جگہ۔ دراصل مجھے تاریخِ طب سے اب جو عشق سا ہوگیا ہے، یہ مجھے ہر اس کوچے کی طرف لے جاتا ہے جہاں محبوب کی کوئی جھلک نظر آجاتی ہے۔

س : تو پھر آپ نے کتنے کوچے چھانے اور وہاں سے کیا پایا؟

ج : الطاف صاحب، آپ کے سوال میں بڑی شوخی اور بے ساختہ پن ہے۔ اس لیے مَیں بھی حالِ دل سنانے میں رازداری سے کام نہیں لوں گا۔ مَیں ایران، سعودی عرب، شام، عراق، لبنان، ترکی، مصر، یونان، فرانس، ہسپانیہ اور انگلستان کی سرزمینوں سے گزرا ہوں، انہیں پیار کیا ہے۔ ان سے تنہائی میں باتیں کی ہیں اور ہر سرزمین سے گزرتے ہوئے دل کی لوح پر کچھ اثرات نقش کیے ہیں۔ مَیں جب عرب کی سرزمین میں داخل ہوا، تو مکّہ و مدینہ کی مقدس بستیوں میں وہی فرق محسوس کیا، جو ابوجہل کی درشتی و سخت مزاجی اور ایوب انصاری کی مہمان نوازی اور فراخدلی میں تھا۔ عراق کی راہوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں کرب وبلا کا معرکہ ابھی ابھی پیش آیا ہے اور نامعلوم ابھی اور کتنے پیش آئیں گے۔ ایران میں مجھے سب سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا کہ وہاں کے لوگوں میں قومی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ اپنے شعراء، حکماء اور فضلاء کے کاموں کو حسین اور اچھوتے انداز میں دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں انہیں دیکھ کر یقین آگیا کہ واقعی سعدؔی اور حافظؔ کے سمن زاروں میں ایک غیر فانی حسن اور نہ روٹھنے والی بہار زندگی کو تازگی بخش رہی ہے۔ لبنان کا خطّہ اپنے فطری حسن اور نسوانی جمال و رعنائی کے اعتبار سے بہشت کا ایک قطعہ ہے۔ عالیہ اور ہمدان کی پہاڑیاں ـــ کچھ ایسی ہیں جہاں سب کچھ بھول جانے کو جی چاہتا ہے۔ جذبات میں میٹھی میٹھی خواہشات کا رس کچھ اس طرح گھلتا ہے کہ انسان بے ساختہ اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا ہے۔ سوچا کہ اگر مشیت خود اس منظر کی مستی کو دیکھ لے تو وہ بھی لڑکھڑا جائے۔

ترکی کے عوام پاکستان سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ وہاں کے دیہاتیوں کو اگر پتہ چل جائے کہ یہاں کوئی پاکستانی آیا ہے تو وہ دیوانہ وار اس طرف لپکیں گے اور اسے اس طرح جھرمٹ میں لے لیں گے جیسے وہ ان کا محبوب ہے جس کا وہ برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔ پاکستان سے بے لوث وابستگی اور شیفتگی کے یہ روح افروز مناظر اور کہیں نظر نہیں آئے۔

یونان میں داخل ہُوا تو قو کے مقام پر پہنچا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں بقراط رہا کرتا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک چنار کا درخت تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس درخت کے نیچے بقراط درس دیا کرتا تھا۔ وہاں کے گرد و پیش نے مجھے کچھ ایسا مسحور کیا کہ مَیں بے خودی کے عالم میں اس درخت کے نیچے لوٹنے لگا۔ کیا لذّت تھی، مَیں بیان نہیں کر سکتا۔ جی چاہتا تھا زندگی کے کچھ لمحے اس عالمِ جذب و کیف میں گزار دوں۔

ہسپانیہ کی سرزمین نے مجھے غور و فکر کے نئے زاویے عطا کیے اور امید و یقین کی نئی عظمتیں بخشیں۔ مجھے وہاں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ ان کے معصوم طرزِ استفسار اور ان کی ایک دبی دبی معصوم خواہش نے مجھے چونکا دیا۔ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ تم طارق کے متعلق کچھ جانتے ہو۔ مَیں جو کچھ جانتا تھا، اسے بتا دیا۔ اس نے بار بار اصرار کیا کہ مَیں اس داستان کو دہراتا رہوں۔ مَیں دہراتا رہا اور لوگوں کو جمع کر لایا۔ وہ بھی اسی اشتیاق سے میری باتیں سنتے رہے اور جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو ہمارے ہمراہ شائقین کا ایک انبوہِ کثیر تھا۔ وہاں بھی وہ طارق کی باتیں سنتے رہے۔ مَیں نے ایک شخص سے پوچھا کہ آپ ہماری تاریخ میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟ اس نے فرطِ مسرت سے جواب دیا "یہ تاریخ ہماری بھی تو ہے۔ اس سرزمین کے چپّے چپّے پر آپ لوگوں کے انمٹ نقوش ثبت ہیں۔ ہماری زبان، ہمارا کلچر، ہماری لائبریریاں، ہمارے معابد اور ہماری زندگی کے اور دوسرے شعبے آپ لوگوں کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کتنے اچھے لوگ تھے۔"

اور جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ جتنے اشخاص موجود تھے ان کے دلوں میں ایک نامعلوم جذبہ اُبل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس خطّے میں اسلام کی تبلیغ کا معقول انتظام ہو جائے تو صرف چند سالوں میں یہ قطعۂ ارضی دوبارہ اسلام کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ جنرل فرانکو نے وہاں تشدّد کی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے۔ اس سرزمین میں نماز ادا کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ ان تمام پابندیوں اور بندشوں کے باوجود یہاں اسلام پنپ سکتا ہے اور اسلام تو پنپا ہی کرتا ہے۔ بندشوں اور پابندیوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر۔

س : آپ نے اختر شیرانی کو قریب سے دیکھا ہے اس لیے آپ اختر و سلمیٰ کے بارے میں زیادہ صحیح بات بتا سکتے ہیں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ سلمیٰ صرف ایک فرضی محبوبہ تھی۔

ج : سلمیٰ کے متعلق مَیں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اختر کی صرف فرضی محبوبہ نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ نام فرضی تھا لیکن محبوبہ فرضی نہ تھی۔ مَیں اس کا نام اور پتہ بھی جانتا ہوں لیکن اختر کی خواہش تھی کہ اسے راز میں رکھا جائے۔ مَیں مرحوم کی خواہش کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ سلمیٰ ایک سلجھی ہوئی اور پاکیزہ شخصیت کی مالک ہے۔ اس کا ادبی مذاق نہایت شستہ اور نکھرا ہُوا ہے۔ اسے اختر سے ایک ایسی محبت تھی جس میں پاکیزگی اور روحانیت کارفرما تھی۔ شروع شروع میں وہ ایک دوسرے کو فنکار کی حیثیت سے چاہتے تھے لیکن بعد میں یہ چاہت و پیار زندگی بھر کا اضطراب بن گیا۔ مجھے اختر کا وہ شعر نہیں بھولتا، جو اس نے سلمیٰ کی بیماری کے موقع پر لکھا تھا ؎

سارى دنیا کے مریضوں کو شفا دے یارب　　آج معلوم ہُوا ہم کو علالت کیا ہے

معلوم نہیں لوگ یہ بات مانتے ہوئے کیوں ہچکچاتے ہیں کہ اختر کی بھی کوئی محبوبہ ہو سکتی ہے۔ آخر اس میں استبعاد کا کونسا پہلو ہے؟ تقریباً ہر بڑا شاعر کسی نہ کسی شخصیت سے ضرور متاثر ہُوا ہے۔ غالب کے انداز میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رعنائی خیال کے لیے کسی شخص کا تصوّر ضروری ہے ۔۔